خدائے سخن

(میر تقی میر)

,,دهلوی شاعری کی روایات کی بھرپور ترجمان دهلوی غزل اور اس کے بہترین نمائندے میر تقی میر ھیں - اگر کوئی اور شاعر ناخدائے سخن ہوسکتا ھے تو میر بلاشبہ خدائے سخن ھیں - جیسا رچاؤ لذت اور کیفیت سادگی اور دل نشینی دل گدازی اور اثر آفرینی ان کے کلام بالخصوص غزل میں ملتی ھے اس کی مثالیں شاعری کی تاریخ میں شاذھی ملتی ھیں -

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی ____________________

***

"جب کسی نے کہا کہ فارسی شعرا میں فردوسی' انوری اور سعدی دنیائے شاعری کے پیغمبر ھیں تو ایک سخن سنج نے پوچھا "اور حافظ؟" فوراً جواب ملا وہ تو خدائے سخن تھا"

اردو شاعری بھی اپنا خدا رکھتی ھے اور وہ میر کہلا تا ھے"

مجنوں گورکھپوری ____________________

***

مولانا آزردہ کے مکان پر ان کے چند احباب جن میں مومن اور شیفتہ بھی تھے ایک روز جمع تھے میر کی غزل کا یہ شعر پڑھا گیا :-

اب کے جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے
دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

شعر کی بے انتہا تعریف ھوئی اور سب کو یہ خیال ھوا کہ اس قافیہ کو ھرشخص اپنے اپنے سلیقہ اورفکر کے موافق باندھ کر دکھائے۔ سب قلم دوات اور کاغذ لیکر الگ الگ بیٹھ گئے اورفکر کرنے لگے۔ اسی وقت ایک اور دوست وارد ھوئے ۔ مولانا سے پوچھا کہ حضرت کس فکر میں بیٹھے ھیں مولانا نے کہا "قل ھواللہ" کا جواب لکھ رھا ھوں۔

(حالی ۔ مقدمہ شعروشاعری) ____________________



مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے اِنسان نکلتے ہیں
(میر تقی میر)

خدائے سخن

(میرؔ کی زندگی اور شاعری پر مفصّل تبصرہ اور انتخابِ کلام)

ادریس صدّیقی ایم، اے
ریسرچ سکالر

مکتبہ عزم و عمل
کراچی ۵

تعداد : ایک ہزار

بار اول : اکتوبر ۱۹۶۳ء

زیر اہتمام : محمد حسن۔ ایم مولوی

ناشر : مکتبہ عزم و عمل

طابع: مطبع سعیدی قرآن محل کراچی

دفتر

۲/۶۱۲ بیر الٰہی بخش کالونی کراچی ۵

ہندوستان میں

ترتیبِ مضامین

ذکرِ میر

اردو شاعری میں غزل کا دوسرا نام میر تقی میر ہے۔ میر کا اندازِ بیان، سوزِ حیات اور الم آشنا مزاج ہماری شاعری میں اتنا رچ بس گیا ہے کہ عام طور پر یہی غزل کا فطری مزاج قرار پاگیا۔ میر نے یہ دولتِ بیدار اپنی دلنواز شخصیت فنکارانہ صلاحیت اور گہرے انفرادی اور اجتماعی شعور کی بدولت حاصل کی ہے۔ انہوں نے غمِ حیات کے سنگِ گراں کو کاٹ کر غزل کی جوئے شیر نکالی ہے جس میں شیرینی اور بانکپن ہے لیکن اس کے پس منظر میں کوہ کنی کی ایک طویل اور روح فرسا داستان بھی ہے جو میر کی اپنی زندگی ہے۔ میر کی زندگی اور میر کی شاعری میں فرہاد اور جوئے شیر کی نسبت ہے اسی لئے تو وہ کہتے ہیں۔

کس کس طرح سے میر نے کاٹا ہے عمر کو　　　اب آخر آخر آن کے یہ ریختہ کہا

میر نے زندگی بسر نہیں کی کاٹی ہے، زندگی کاٹنے اور بسر کرنے میں جو فرق ہے وہی میر اور ایک عام انسان کی زندگی کا فرق ہے۔ لیکن ان کی شاعری فقط اپنے ہی دل کا مرثیہ نہیں ہے بلکہ اجتماعی شعور کی بدولت، اس میں دلی کی تہذیب اور ایک عظیم سیاسی اور معاشرتی نظام کے خاک میں مل جانے کا درد واثر بھی شامل ہے اور یہی وہ اثر ہے جو ان کے ذاتی غم کو کائناتی بنا دیتا ہے اور اُن کی شاعری زمان و مکان کی قیود توڑ کر ابدی اور آفاقی رنگ اختیار کر لیتی ہے

میر کا انتقال ۱۲۲۵ھ ۱۸۱۰ء میں ہوا، اس ڈیڑھ سو برس سے زائد عرصے میں اردو شاعری کہاں سے کہاں پہنچ گئی زبان و بیان کے علاوہ شاعری کے موضوع اور نقطۂ نظر میں بھی نمایاں تبدیلیاں ہوئیں اور کتنے ہی شاعروں نے بارگاہ ادب میں اپنے لئے ممتاز اور مستقل جگہیں بنا لیں، لیکن آج بھی میر کی شاعری قطب مینار کی طرح سر بلند ہے اور ان کی شخصیت انقلابات زمانہ کے گرد و غبار سے محفوظ رہی۔ اس طویل عرصے میں تنقید نگاروں کے قلم کی نوک بھی باریک سے باریک تر ہوتی گئی اور انہوں نے کسی کو نہیں بخشا، بیچارے غالب کے پرزے اڑانے کی کوشش کی گئی۔ ذوق کی ملک الشعرائی کا جو طلسم اُن کے ہونہار شاگرد مولانا محمد حسین آزاد نے باندھا تھا وہ کب

کا ٹوٹ چکا۔ مولانا شبلی نے دبیر کو الٹی چھری سے حلال کرنے کی ٹھانی۔ اس سلسلے میں معرکۂ شرر و چکبست کو بھی ذہن میں رکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ نقادوں کے ہاتھوں میں بعضوں کی شاعری تو "عاشق کا گریبان" ہوکر رہ گئی لیکن میر اس معاملے میں خاص خوش نصیب واقع ہوتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نقادوں نے عام طور پر ان کے معاملے میں انصاف اور مروت سے کام لیا ہے، کیونکہ مصطفیٰ خان شیفتہ (مصنف گلشن بیخار) سے لے کر مولانا حالی (مصنف مقدمہ شعر و شاعری) تک ـــــ اور مجنوں گورکھپوری (تنقیدی حاشیے) سے حسن عسکری (مرتب ساقی میر نمبر) تک نے میر کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کیا ہے۔ اور اپنے اپنے ذوق اور علم کے مطابق ان کی شاعری کی تشریح اور توجیہہ پیش کی ہے۔

بعض تذکرہ نگاروں مثلاً شیفتہ نے میر کی شاعری میں "رطب و یابس" کی طرف اشارہ بھی کیا تو اپنی ہی طرف سے یہ معذرت بھی پیش کردی :۔

شعر گر اعجاز باشد بے بلند و پست نیست
در یدِ بیضا ہمہ انگشت ہا یکدست نیست

ہمارے مولانا حالی تو بقول شخصے ادبی ڈکٹیٹر تھے اور شاید اسی لئے غزل پر مارشل لا لگانے کے حامی تھے لیکن انہوں نے

بھی میر کی شاعرانہ عظمت کے سامنے سپر ڈال دی جس کا مفصل ذکر آئندہ صفحوں میں آئے گا۔ ممتاز شعرا نے ہر دور میں میر کی استادی کو تسلیم کیا اور ان کی تقلید کو اپنے لئے فخر جانا اس کی وجہ غالباً یہی ہے کہ میر کی شاعری میں فنکارانہ حسن کے ساتھ وہ جامعیت اور آفاقیت پائی جاتی ہے جسے مشہور نقاد ٹی۔ ایس ایلیٹ نے کلاسیکی ادب کے عناصر میں شمار کیا ہے

میر شعرا کی نظر میں

غالب

۱۔ غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں

۲۔ ریختے کے تمھیں استاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

۳۔ میر کے شعر کا احوال کہوں کیا غالب
جس کا دیوان کم از گلشنِ کشمیر نہیں

ذوقؔ

نہ ہوا پر نہ ہوا میرؔ کا انداز نصیب
ذوقؔ یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

شیفتہؔ

نرالی سب سے ہے اپنی روش اے شیفتہؔ لیکن
کبھی دل میں ہوائے شیوہ ہائے میرؔ پھرتی ہے

بہادر شاہ ظفرؔ

یہ غزل پڑھتے اگر بزم سخن داں میں ظفرؔ
کیونکہ تحسیں کے لئے پھر نہ سر میرؔ ہلے

ناسخؔ

شبہ ناسخؔ نہیں کچھ میرؔ کی استادی میں
آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میرؔ نہیں

مصحفیؔ

اے مصحفیؔ تو اور کہاں شعر کا دعوے؟
پھبتا ہے یہ اندازِ سخن میرؔ کے منہ پر

میر مہدی مجروح

یوں تو ہیں مجروح شاعر سب فصیح
میرؔ کی پر خوشش بیانی اور ہے

جلالؔ لکھنوی

کہنے کو جلالؔ آپ بھی کہتے ہیں وہی طرز
لیکن سخن میر تقی میرؔ کی کیا بات

حالیؔ

حالیؔ سخن میں شیفتہؔ سے مستفید ہوں
غالبؔ کا معتقد ہوں مقلد ہوں میرؔ کا

اکبرؔ الہ آبادی

میں ہوں کیا چیز جو اس طرز پہ جاؤں اکبرؔ
ناسخؔ و ذوقؔ بھی جب چل نہ سکے میرؔ کے ساتھ

حسرتؔ موہانی

شعر میرے بھی ہیں پُر درد ولیکن حسرتؔ
میرؔ کا شیوۂ گفتار کہاں سے لاؤں

گذرے بہت استاد مگر رنگِ اثر میں
بے مثل ہے حسرتؔ سخنِ میرؔ ابھی تک

میراجی

میرؔ ملے تھے میراجی سے باتوں سے ہم جان گئے
فیض کا چشمہ جاری ہے حفظ ان کا بھی دیوان کریں

ابن انشا

۱۔ دل پہ جو بیتے سہہ لیتے ہیں اپنی زباں میں کہہ لیتے ہیں
انشاؔ جی ہم لوگ کہاں اور میرؔ کا رنگِ کلام کہاں

۲۔ اک بات کہیں گے انشاؔ جی تمہیں ریختہ کہتے عمر ہوئی
تم ایک جہاں کا علم پڑھے، کوئی میرؔ سا شعر کہا تم نے

میرؔ کے بارے میں شاعروں کا رویّہ خاصا نیاز مندانہ رہا ہے اور میراجیؔ کے الفاظ میں میرؔ کے فیض کا چشمہ جاری ہے، ذوقؔ و غالبؔ نے میرؔ کی استادی کا اعتراف کیا حسرتؔ کو ان کا سا شیوۂ گفتار پیدا کرنے کی حسرت ہی رہی اور حالیؔ نے ان کی تقلید پر فخر کیا۔ خود میرؔ کے زمانے میں تو ان کی غزلیں لوگ سوغات کے طور پر ایک شہر سے

دوسرے شہر لے جاتے تھے، لیکن آج بھی میر صاحب کا کلام تبرک سمجھا جاتا ہے اور ان کے سیدھے اور سچے شعر سن کر لوگوں کے دلوں میں عقیدت اور احترام کا جذبہ بڑھ جاتا ہے —— قدامت پرستی سے ترقی پسندی تک —— ہر دور میں میر کا فن نہ صرف زندہ رہا بلکہ اجاگر ہوتا گیا۔ شعرا تو میر صاحب کی برادری کے لوگ ہیں اس لئے ممکن ہے انکی رائے کو زیادہ اہمیت نہ دی جائے، لیکن سخن فہموں تذکرہ نگاروں اور جدید نقادوں میں اس بات پر کوئی اختلاف نہیں کہ میر غزل کے بادشاہ ہیں اور اس عروس سخن کا مزاج جیسا انہوں نے پہچانا اور کسی سے بن نہ پڑا۔ چند اہم تذکروں کے اقتباس سے یہ حقیقت اور واضح ہو جائے گی۔ البتہ اقتباس پیش کرنے سے قبل ایک بات کی جانب اشارہ کرنا ضروری ہے اور وہ یہ کہ عصر حاضر ہی کے ایک "نقاد" کے الفاظ میں "عصر حاضر کے نقاد جو اپنی علمی میراث پر دسترس نہیں رکھتے تذکروں کی زبان کو عبارت آرائی سمجھتے ہیں انہوں نے اس پر کبھی غور نہیں کیا کہ عربی اور فارسی تصانیف میں جو اصول نقد ادبیات کے لئے وضع کئے گئے ہیں ان کی نوعیت کیا ہے، اور وہ جدید انتقاد سے کہاں تک مشابہ اور کس حد تک مختلف ہیں اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ قدیم نقادوں کی اصطلاحات اور

ان کے رموز و علائم عصر حاضر کے بیشتر نقادوں کو بے معنی معلوم ہوتے ہیں، مثال کے طور پر فصاحت، بلاغت معاملہ بندی وقوع گوئی، انداز کی متانت اسلوب کا خوش مزہ ہونا یہ تمام اصطلاحات ہیں "جن کا صحیح مفہوم جاننا ضروری ہے یہ خیال کسی قدر انتہا پسندانہ ہے تاہم یہ بات تو اپنی جگہ رہتی ہے کہ تذکروں کی تنقید، وہ جیسی بھی ہے، بہر حال ایسی نہیں ہے کہ ہم اسے نظر انداز کردیں ۔ چنانچہ ہمیں تنقید کے اس آئینے میں بھی میر کا عکس دیکھنا چاہیے۔

میر نقادوں کی نظر میں

مجموعۂ نغز (میر قدرت اللہ قاسم)

"شاعرے است بے نظیر و سخن سنج است خوش تقریر — میرِ اقلیم شیریں بیانی، دبیر قلمروے عذب البیانی۔ طرز گفتارش بے بدل۔ انداز اشعار ضرب المثل"

گلشن بیخار (نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ)

"لا یسما در غزل سرائی و مثنوی گوئی گوئے سبقت می رباید۔ بلند و پست کہ در کلامش بینی و رطب و یابس کہ در ابیاتش بنگری، نظر نہ کنی و از نظرش نیفگنی کہ گفتہ

اند : فرد

شعر گر اعجاز باشد بے بلند و پست نیست
در ید بیضا ہمہ انگشت ہا یکدست نیست"

تذکرہ گردیزی
(فتح علی حسن گردیزی)

"فقیر سیر اشعارش نمودہ و چشمے آب دادہ خطا کہ در آں تلاش معنی بیگانہ کردہ است و حرف آشنا را بروئے کار آوردہ"

تذکرہ ہندی
(غلام ہمدانی مصحفی)

"استادی ریختہ بر و مسلم است، ہمہ ریختہ گویان ہند سند از کلامش می آرند و او را دریں فن مستثنیٰ می دانند والحق کہ چنیں است"

گلشن ہند
(مرزا علی لطف)

"میر شیریں مقال ہیں اور ریختہ گویان سابق و حال میں نسبت خورشید و ماہ ہے اور فرق سفید و سیاہ ہے بلکہ حجاب اگر مانع نہ ہو بیان کا تو تفاوت ہے زمین اور آسمان کا۔ اقسام نظم میں یہ صدر نشین بارگاہ سخن دانی ہر قسم چکیدۂ خامۂ معجز نگار رکھتا ہے لیکن سچ تو یہ ہے کہ نظم غزل میں ید بیضا رکھتا ہے"

آبِ حیات
محمد حسین آزاد

"میر صاحب کی زبان شستہ، کلام صاف، بیان ایسا پاکیزہ جیسے باتیں کرتے ہیں، دل کے خیالات جو کہ سب کی طبیعتوں کے مطابق ہیں، محاورے کا رنگ دیکر باتوں باتوں میں ادا کرتے ہیں، اور زبان میں خدا نے ایسی تاثیر دی ہے کہ وہی باتیں ایک مضمون بن جاتی ہیں، اس واسطے ان میں بہ نسبت اور شعرا کے اصلیت زیادہ قائم رہتی ہے، بلکہ اکثر جگہ یہی معلوم ہوتا ہے کہ گویا نیچر کی تصویر کھینچ رہے ہیں، یہی سبب ہے کہ دلوں پر اثر بھی زیادہ کرتی ہیں، وہ گویا اردو کے سعدی ہیں۔"

مقدمہ شعر و شاعری
(مولانا حالی)

"چاک گریباں کا مضمون جو متاخرین میں ایک نے تیس طرح پر باندھا ہے، میر تقی میر کے یہاں اس طرح پر بندھا ہوا ہے:-

اب کے جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے
دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

مجھ کو ہرگز امید نہیں کہ متاخرین میں سے کسی نے اس سے بہتر "چاک گریباں" کا مضمون باندھا ہو

کاشف الحقائق
(امداد امام اثر)

"میر صاحب غزل سرائی میں کبھی واردات قلبیہ اور رموز ذہنیہ کے احاطہ سے باہر قدم نہیں رکھتے ...... تب ہی تو ان کے کلام میں سوز و گداز، خستگی، بشریت، رنگینی، ملاحت، شیرینی وغیرہ کی کیفیتیں بدرجۂ کثیر پائی جاتی ہیں۔"

گل رعنا
حکیم عبدالحئی

"میر صاحب غزل کے بادشاہ ہیں۔"

اثر لکھنوی

"خوشنما فارسی تراکیب کا مطبوع صرف میر کے کلام کی ایک نمایاں خصوصیت ہے اس کے بعد مومن اور غالب نے یہ راستہ اختیار کیا، بہت سی ترکیبیں مثلاً کاؤکاؤ، سادہ و پرکار، ستم ظریف شیشہ باز، یک بیابان وغیرہ جن کے وضع کرنے کا سہرا غالب کے سر باندھا جاتا ہے میر کی دست نگر ہیں۔ یہی نہیں بلکہ وہ طرز جو غالب سے منسوب کیا جاتا ہے اس کی داغ بیل بھی میر ڈال گئے تھے۔"

یہ چند اقتباسات ان سخن سنجوں کی تحریروں سے لئے گئے ہیں جنہیں "اگلے وقتوں کے لوگ" کہا جاتا ہے، لیکن جدید نقادوں کی رائے بھی اس سے مختلف نہیں، میر صاحب تو خود ہی بڑے نقاد تھے جس کا تحریری ثبوت انہوں نے "تذکرۃ نکات الشعرا" لکھ کر فراہم کیا ہے، میر صاحب خودنگر اور خودشناس بھی تھے، ان کا شمار ایسے لوگوں میں ہے جو خود اپنی تعریف کرنا جانتے ہیں، ہم اسے شاعرانہ تعلّی بھی کہہ سکتے ہیں، لیکن میرؔ کی زندگی اور شخصیت کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ ان میں بلا کی انفرادیت اور کسی قدر خودپرستی بھی تھی لیکن ہم اسے خودشناسی ہی کہیں گے۔ کیونکہ اقبالؔ کے فلسفۂ خودی کا مطالعہ کرنے کے بعد ہمارے خیالات کافی بدل گئے ہیں ــــ میرؔ کی اس بڑھی ہوئی انفرادیت، خودنگری اور خودپرستی کو ان کی بددماغی بھی بتایا گیا ہے، بہر حال یہ بات سچ ہے کہ میرؔ اپنے آپ کو پہچانتے تھے۔ اور شعر و ادب کے بارے میں ایک گہرے تنقیدی شعور کے مالک تھے اس لئے ہمیں اس سوال سے دلچسپی ہونی چاہئے کہ خود میر صاحب اپنے بارے میں اور اپنی شاعری کے متعلق کیا رائے رکھتے تھے، بعد میں تنقیدی بحث سے یہ بات واضح ہو جائے گی کہ آیا وہ کسی قسم کی غلط فہمی یا خوش فہمی کا شکار تھے یا واقعی ان میں وہ خصوصیتیں اور صلاحیتیں موجود تھیں جن کا اظہار انہوں اپنے اشعار میں براہ راست یا بالواسطہ طور پر کیا ہے فی الحال میر صاحب کو موقع دینا چاہئے کہ وہ اپنی سی کہہ سنائیں۔

میر خود اپنی نظر میں

سارے عالم پر ہوں میں چھایا ہوا
مستند ہے میرا فرمایا ہوا

○

اگرچہ گوشہ نشیں ہوں میں شاعروں میں میرؔ
پہ میرے شعر نے روئے زمیں تھام لیا

○

دل کس طرح نہ کھینچیں اشعار ریختہ کے
بہتر کیا ہے میں نے اس عیب کو ہنر سے

○

جو دیکھو مرے شعر تر کی طرف
تو مائل نہ ہو پھر گہر کی طرف

○

سب میرؔ کو دیتے ہیں جگہ آنکھوں میں اپنی
اس خاکِ رہِ عشق کا اعزاز تو دیکھو

○

ہیں مشتِ خاک لیکن جو کچھ ہیں میرؔ ہم ہیں
مقدور سے زیادہ مقدور ہے ہمارا

مرثیے دل کے کتنے کہہ کے دیے لوگوں کو
شہر دلی میں ہے سب پاس نشانی اسکی

کچھ ہند ہی میں میر نہیں لوگ جیب چاک
ہے میرے ریختوں کا دِوانا دکن تمام

سرسبز ملک ہند میں ایسا ہوا کہ میر
یہ ریختہ لکھا ہوا تیرا دکن گیا

سرسبز ہند ہی میں نہیں کچھ یہ ریختہ
ہے دھوم میرے شعر کی سارے دکن کے بیچ

جس شعر پہ سماع تھا کل خانقاہ میں
وہ آج میں سنا تو ہے میرا کہا ہوا

بات بنانا مشکل سا ہے شعر سبھی یاں کہتے ہیں
فکر بلند سے یاروں کو اک ایسی غزل کہہ لانے دو

تری چال ٹیڑھی تری بات روکھی
تجھے میر سمجھا ہے یاں کم کسی نے

○

صحبت کسو سے رکھنے کا اس کو نہ تھا دماغ
تھا میر بے دماغ کو بھی کیا ملا دماغ

○

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

○

باتیں ہماری یاد رہیں پھر باتیں ایسی نہ سنئے گا
پڑھتے کسی کو سنئے گا تو دیر تک سر دھنئے گا

○

مری قدر کیا ان کے کچھ ہاتھ ہے
جو رتبہ ہے میرا مرے ساتھ ہے
کہاں پہنچیں مجھ تک یہ کیڑے حقیر
گیا سانپ پیٹا کریں اب لکیر

(مثنوی اژدر نامہ)

○

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

برسوں لگی رہی ہیں جب مہر و مہ کی آنکھیں
تب کوئی ہم سا صاحب صاحب نظر بنے ہے

نہ رکھو کان نظمِ شاعرانِ حال پر اتنے
چلو ٹک میر کو سننے کہ موتی سے پروتا ہے

میر دریا ہے سنے شعر زبانی اس کی
اللہ اللہ رے طبیعت کی روانی اس کی
ایک ہے عہد میں اپنے وہ پراگندہ مزاج
اپنی آنکھوں میں نہ آیا کو ثانی اس کی

کیا جانوں دل کو کھینچے ہیں کیوں شعر میر کے
کچھ ایسی طرز بھی نہیں ایہام بھی نہیں

مجھ کو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب میں نے
رنج و غم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا

حسن تو ہے ہی، کرو لطف زباں بھی پیدا
میر کو دیکھو کہ سب لوگ بھلا کہتے ہیں

اس فن میں کوئی بے تہہ کیا ہو مرا معارض
اول تو میں سند ہوں پھر یہ مری زباں ہے،

○

یہ میر ستم کشتہ کسو وقت جواں تھا
انداز سخن کا سبب شور و فغاں تھا

جادو کی پڑی پرچۂ ابیات تھا اس کا
منہ تکیے غزل پڑھتے عجب سحر بیاں تھا

جس راہ سے وہ دل زدہ دلّی میں نکلتا
ساتھ اس کے قیامت کا سا ہنگامہ رواں تھا

افسردہ نہ تھا ایسا کہ جوں آب زدہ خاک
آندھی تھا، بلا تھا، کوئی آشوب جہاں تھا

○

ان اشعار سے میرؔ کی شخصیت کے کئی پہلو سامنے آجاتے ہیں، جن کی روشنی میں ان کی شاعری کو پرکھنے کی کوشش کریں گے ۔ اس کے علاوہ کسی فن پارے کی قدر و قیمت متعین کرنے کے لئے ہمیں ان خارجی واقعات اور داخلی حالات کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے جو شاعر کی زندگی اور فن پر اثر انداز ہوتے ہیں اور شخصیت کا جزو بن کر فن میں راہ پاتے ہیں۔۔۔۔ کیونکہ یہ حقیقت اپنی جگہ اٹل ہے کہ شاعر سماج کا ایک باشعور فرد ہونے کی حیثیت سے خارجی تعلقات اور زندگی کے واقعات اور حقائق سے بالکل بے نیاز

نہیں رہ سکتا، اس کا ذہن شعوری اور غیر شعوری طور پر خارجی واقعات کا اثر قبول کرتا ہے بلکہ حساس دل اور دیدۂ بینا کی بدولت، شاعر دل کی دنیا میں رہ کر بھی ان باتوں کا اثر نسبتاً زیادہ شدت سے لیتا ہے جو اس کے دیکھنے اور سننے میں آتی ہیں — حالانکہ مصنف شعر الہند کا خیال یہ ہے کہ "غزل تمام تر اندرونی جذبات و کیفیات کی تشریح ہوتی ہے. اس لئے اس میں طرزِ شاعری کے داخلی پہلو سے کام لیا جا سکتا ہے —" اسی طرح ڈاکٹر یوسف حسین کا کہنا ہے کہ "غزل گو شاعر اپنے دل کی دنیا کی سیر میں ایسا منہمک ہوتا ہے کہ اسے اوپر آنکھ اٹھانے اور خارجی مطالعہ کرنے کی فرصت اور ضرورت نہیں — وہ اپنی ذات میں سب کچھ پا لیتا ہے —" یہ داخلی نقطۂ نظر خواہ کتنا ہی درست کیوں نہ ہو نامکمل ہے، اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ شاعر دنیاوی روابط سے بے نیاز، بدھ مذہب کا کوئی دیوتا ہے جو ہمیشہ مراقبے میں رہتا ہے اور عالم خیال ہی میں گیان اور نروان کی تمام منزلیں طے کرتا رہتا ہے، عملاً یہ بات نہیں ہے۔

پوری دنیا اور اس کے مظاہر فطرت کی کھلی ہوئی کتاب ہے جسے ہر انسان پڑھ سکتا ہے، شاعر کی قدرتِ احساس اور مشاہدے کی صلاحیت عام لوگوں سے کہیں زیادہ ہوتی ہے اور وہ زیادہ تفصیل کے ساتھ دنیا دیکھ سکتا ہے۔ مولانا حالی نے غلط نہیں کہا تھا کہ "اگر کوئی دیکھے اور سمجھے تو دھر تماشے صبح سے شام تک ایسے عبرت خیز نظر آتے ہیں کہ شاعر کی تمام عمر اس کی جزویات بیان کرنے کے لئے کافی نہیں ہو سکتی —"

البتہ شاعر اور خصوصاً غزل گو شاعر کے مشاہدے اور اظہار کے طریقے مختلف ہوتے ہیں اور وہ اپنے دل کا مطلب استعاروں میں بیان کرتا ہے، وہ خارجی تاثرات کو اپنی ذات میں جذب کر لیتا ہے اور اپنی تخلیقی قوت کے سہارے انہیں نئی شکل میں پیش کرتا ہے۔ گویا ہر شعر کے پس منظر میں احساس اور مشاہدے کی کتنی ہی وادیاں ایسی ہوتی ہیں جنہیں شاعر کا ذہن عبور کرتا ہے، پھر بھی شاعر کو وہ الفاظ میسر نہیں آتے جو احساس کی صحیح ترجمانی کر سکیں، مثلاً جوش ملیح آبادی کہتے ہیں :-

مر کے بھی تو شاعری کا بھید پا سکتا نہیں
عقل میں یہ مسئلہ نازک ہے آ سکتا نہیں

تو سمجھتا ہے جو کہنا چاہیے تھا کہہ گیا
پوچھ شاعر سے کہ وہ کیا کہہ سکا کیا رہ گیا

کون سمجھے شعر یہ کیسے ہیں اور کیسے نہیں
دل سمجھتا ہے کہ جیسے دل میں تھے ویسے نہیں

اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ شاعر کے فن کو سمجھنے کے لئے اس کی شخصیت اور خارجی ماحول دونوں کا مطالعہ ضروری ہے، آیئے پہلے اس دور کے انقلاب انگیز واقعات پر نظر ڈالیں جو تاریخ کے اوراق میں بکھرے ہوئے ہیں، اس کے بعد میر کی زندگی کی کتاب کھولیں گے

میر کا عہد

۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب عالمگیر کی آنکھ بند ہوتے ہی ہندوستان کی تاریخ کا رخ بدل گیا، ظہیر الدین بابر نے جس حکومت کی بنیادیں استوار کرنے میں اپنے عزم وفراست کی تمام قوتیں صرف کردی تھیں اب اس کا سنبھالنے والا کوئی نہ تھا، عالمگیر کے بعد خاندان مغلیہ میں کوئی ایسی ہمہ گیر شخصیت نظر نہیں آئی تھی جو تخت طاؤس کی عظمت کو برقرار رکھ سکے اور لال قلعے کے پرچم کو سرنگوں ہونے سے محفوظ رکھ سکے، خود عالمگیر کو اپنی زندگی میں اس حقیقت کا گہرا احساس تھا کہ شہزادوں میں سے کسی کے ہاتھوں میں اتنی قوت نہیں کہ وہ کشمیر سے راس کماری تک پھیلی ہوئی عظیم الشان سلطنت کی باگ ڈور سنبھال سکے، اس خیال سے اس نے اپنے لڑکوں کو فنون سپہ گری اور رموز حکمرانی کی اعلیٰ تعلیم دلوانے کا انتظام کیا تھا، لیکن کوئی بھی اس کا صحیح جانشین نہ بن سکا۔

عالمگیر کی وفات کے فوراً بعد ہی اقتدار

کی جنگ شروع ہوگئی، اور سارے ملک میں فتنہ و فساد کی آگ بھڑک اٹھی۔ آخر بہادر شاہ اول، جو علم و فضل میں یکتائے زمانہ تھا، تخت پر قابض ہونے میں کامیاب ہوگیا، لیکن وہ پورے ملک کے حالات پر قابو نہ پا سکا، اور ۱۷۱۲ء میں انتقال کر گیا، اس کے بعد انتشار اور خانہ جنگی کا ایک نیا دور شروع ہوگیا، اور مغلیہ سلطنت کا جاہ و جلال ختم ہونے لگا۔

جہاندار شاہ تخت پر قابض ہوتے ہی عیش و عشرت میں پڑ گیا اور سلطنت کے کاموں سے اسے برائے نام ہی سروکار رہ گیا ــــ اسے اپنی ہوس پرستی اور شراب نوشی سے اتنی کہاں فرصت تھی کہ ملک کے گوشے گوشے میں پھیلے ہوئے ہنگاموں اور مخالفتوں کے طوفان کا مقابلہ کرتا۔ ایک معمولی عورت لال کنور اس پر اس قدر غالب آگئی کہ امور سلطنت میں بھی اس کا عمل دخل ہوگیا۔

تیموری تاریخ میں طوائف الملوکی کا یہ سیاہ ترین دور تھا۔ نا اہلوں اور خوشامدیوں کو بڑے بڑے عہدے اور انعام و اکرام ملتے رہے، اور شریف دانشور اپنی قسمت کو روتے رہے، ایسے عالم میں علم و ادب کی سرپرستی اور حوصلہ افزائی کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے۔

تقریباً سال بھر بعد فرخ سیر نے جہاندار شاہ کو قتل کرا دیا اور خود حکمراں بن گیا، اس نے تقریباً سات برس تک حکومت کی لیکن درباری سازشوں اور ریشہ دوانیوں سے وہ بھی محفوظ نہ رہ سکا، ۱۷۱۹ء میں اسے اندھا کرا کے قتل کرا دیا گیا، اس کے بعد محمد شاہ کا زمانہ آیا، جو تاریخ میں محمد شاہ رنگیلے کے نام سے مشہور ہے، مصنف بزم تیموریہ نے لکھا ہے "محمد شاہی عہد میں

سادات کے قتل کے بعد خانہ جنگیوں کی کمی نسبتاً ضرور رہی لیکن اس طویل زمانے میں وہ تمام سامان ایک ایک کر کے جمع ہونے شروع ہو گئے جو ایک عظیم الشان سلطنت کو نیست و نابود کر دینے کے لئے ضروری ہیں ، دربار میں اکبری اولوالعزمی کے بجائے شیشہ و پیالے کی بدمستی تھی ، شاہجہانی شوکت و حشمت کی جگہ حسرت و یاس کی تصویر تھی اور عالمگیری جاہ و جلال کی جگہ بے بسی اور بے کسی کا عبرتناک منظر تھا ۔ بادشاہ وقت اپنے امراء اور درباریوں کا آلۂ کار ہو کر رہ گیا ، خود غرض امراء میں نہ نیت کی پاکیزگی تھی نہ مقصد کی یک جہتی ـــــ رہی سہی قوت نادر خاں کی خوں ریزی ، مرہٹوں کی غارت گری اور روہیلوں کی سرکشی سے جاتی رہی ـــــ " سلطنت کا دبدبہ اور شوکت تو جاتی ہی رہی مغلیہ سلاطین اپنی زبان بھی کھو بیٹھے ، دربار اور بازار میں اب فارسی کی بجائے ہندوستانی زبان (اردو) کا اثر و اقتدار تھا ـــــ "

محمد شاہی دور کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس زمانے میں عالموں فاضلوں اور شاعروں کی ایک نمایاں جماعت موجود تھی جن میں سعد اللہ گلشن، عبد القادر بیدل ، سراج الدین خان آرزو ، شاہ حاتم ، میر ضاحک ، مظہر علی جان جاناں ، اور جعفر زٹلی خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۔

محمد شاہ دلی میں اپنی عیش و نشاط کی محفلوں میں دنیا و مافیہا سے بے خبر تھا اور دہلی کے باہر مرہٹے ، سکھ اور جاٹ فتنہ پردازی اور ہنگامہ آرائی کر رہے تھے ، ملک سے باہر بھی کئی نظریں دہلی کے تخت طاؤس پر لگی تھیں چنانچہ ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ نے حملہ کیا اور سلطنت مغلیہ کا رہا سہا وقار مٹی میں مل گیا

نادر شاہ کہنے کو تو اٹھاون دن دہلی میں رہا، لیکن یہ عرصہ خصوصاً دلی والوں کے لئے قیامت خیز ثابت ہوا۔ ہزاروں آدمی تہ تیغ کر دیئے گئے، ہزاروں مردوں اور عورتوں نے اپنی عزت اور آبرو بچانے کے لئے کنوؤں میں کود کر جان دے دی ۔۔۔۔ نادر شاہ ۵ مئی ۱۷۳۹ء کو واپس گیا اور مغلیہ سلطنت کو آخری سانسیں لینے کے لئے چھوڑ گیا، سکھوں اور مرہٹوں نے بھی مرکزی حکومت کی کمزوری سے پورا فائدہ اٹھایا اور شورشیں بڑھنے لگیں اودھ اور دکن کے علاقے خود مختار بن گئے ۔۔۔۔ سیاسی انتشار کے ساتھ اقتصادی بد حالی بھی انتہا کو پہنچ چکی تھی اور اچھے اچھے خاندان نان شبینہ کے محتاج ہو گئے تھے۔

دہلی میں نادر شاہ کے قتل عام اور تباہ کاریوں کے المناک واقعات دلوں سے محو نہ ہوتے تھے کہ احمد شاہ ابدالی کے حملے کی خبریں مشہور ہوئیں۔ اور دہلی والوں کے سامنے ایک بار پھر قیامت کا نقشہ پھر گیا ۔۔۔ ابھی ابدالی دہلی نہ پہنچا تھا کہ محمد شاہ انتقال ہو گیا (۱۷۴۸ء) اس کے بعد اس کا بیٹا احمد شاہ تخت کا مالک بنایا گیا ۔۔ اس کی عمر اکیس بائیس سال کے قریب تھی اور تعلیم و تربیت ناقص ۔۔۔۔ جلد ہی وہ عیش و عشرت میں مبتلا ہو گیا اور دربار کے معمولی معمولی لوگوں کو اس کے مزاج میں دخل حاصل ہو گیا رفتہ رفتہ شاہی محل حسینوں اور ماہ پیکروں کا چمن زار بن گیا اور وہ اس نگار خانے میں شہزادہ گلفام بنا ہوا حسن و محبت کے ترانے گا تا رہا یہ سب کچھ ایسے وقت میں ہو رہا تھا کہ ابدالی ہندوستان کی سرحدوں میں داخل ہو چکا تھا

درباری اور فوجی اس صورت حال سے سخت نالاں تھے، وہ دولت جو حکومت کے استحکام کے خاطر سپاہیوں کی تنخواہوں اور فوجی ساز و سامان پر صرف ہونی چاہئے تھی، عیش پرستی اور ہوسناکی کے تقاضے پورے کرنے پر بہائی جا رہی تھی ظاہر ہے ایسی صورت میں فوج کو حکومت کے بننے بگڑنے سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی —— نتیجہ یہ ہوا کہ مغلوں کی وسیع و عریض سلطنت کے حصے بخرے ہونے لگے، گجرات میں مرہٹوں نے طوفان برپا کر دیا، بنگال، بہار اور اڑیسہ کے علاقے علی وردی خاں کے قبضے میں چلے گئے، اودھ میں صفدر جنگ برسر اقتدار آ گئے، اسی طرح پنجاب اور دکن بھی مرکزی حکومت سے الگ ہو گئے، اس افراتفری اور سیاسی عدم استحکام کے عالم میں شاعروں اور فنکاروں کی کون خبر لیتا۔ —— علم و ادب کی محفلیں سونی ہو گئیں، بعض رئیسوں اور نوابوں نے اپنی ساکھ اور مصنوعی وضع داری برقرار رکھنے کی خاطر علماء و شعرا کی سرپرستی کی اور انہیں دربار میں جگہ دی لیکن جو لوگ قصیدہ خوانی اور حاشیہ برداری کے آداب سے واقف نہ تھے وہ محلاتی سازشوں کا شکار ہو گئے، آخر گوشہ نشینی اختیار کر لی —— یا دربدر کی ٹھوکریں کھاتے رہے :- ع

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں

محمد شاہ کے بعد تیموری سلطنت اپنے زوال کی آخری صدی میں داخل ہو گئی اور اب بادشاہوں کی حیثیت مجاوروں کی سی رہ گئی، مولانا آزاد کے الفاظ ہیں، "مغلیہ سلطنت ایک ٹوٹی پھوٹی درگاہ تھی جس کے پانچ اور سجادہ نشین

ہوتے ـــ اور نادر شاہ کے حملے کے بعد بقول شاہ ولی اللہ "از سلطنت بجز نامے باقی نہ ماند"۔ احمد شاہ کو اندھا کر کے قتل کر دیا گیا تو عالمگیر ثانی حکمراں بنا لیکن اس کا بھی یہی انجام ہوا۔ اس کے بعد شاہ عالم تخت نشین ہوا ۱۷۵۹ء تقریباً نصف صدی تک برسر اقتدار رہا، لیکن سینتالیس برس کی یہ مدت سیاسی انقلابات اور عبرت انگیز واقعات سے بھری ہوئی ہے، حکومت سنبھالنے کے چند سال بعد اس نے شجاع الدولہ (نواب اودھ) کو اپنا وزیر بنایا، شاہ عالم خود علم دوست اور شاعر تھا، فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتا تھا، آفتاب اس کا تخلص تھا، اس عہد میں اردو کے بعض ممتاز ترین شعرا موجود تھے، تاریخ ادب میں یہ میر و مرزا کا دور کہلاتا ہے، میر و سودا کے علاوہ درد، شاہ نصیر، انشا، اور مضمون وغیرہ کے دم سے شعروادب کی محفلیں سجی رہتی تھیں، مولانا محمد حسین آزاد نے آب حیات میں شاہ عالم اور شعرا کے تعلقات پر روشنی ڈالی ہے، انشا اس کے بڑے چہیتے شاعر تھے سودا تو خیر سے استاد ہی تھے لیکن خواجہ میر درد گوشہ نشین بزرگ تھے اور وہ اپنے تکیے سے باہر نہیں جاتے تھے مولانا آزاد نے لکھا ہے کہ ایک دفعہ شاہ عالم خواجہ میر درد کی محفل میں شریک تھے ان کے پاؤں میں کچھ تکلیف تھی، اس لئے انہوں نے اپنا پاؤں ذرا پھیلا دیا، خواجہ صاحب کو یہ حرکت ناشائستہ بری لگی، اور انہوں نے فرمایا کہ "یہ طریقہ فقیر کے آداب محفل کے منافی ہے"۔ شاہ عالم نے معذرت کی لیکن خواجہ صاحب نے کہا کہ اگر طبیعت اچھی نہیں تھی تو محفل میں شریک ہونا کیا ضرور تھا"

شاہ عالم کو زندگی میں ایک لمحے کے لئے سکون میسر نہ آیا ۱۷۶۴ء میں جنگ

پلاسی کے بعد انگریزوں کا اثر ونفوذ بھی بڑھتے بڑھتے دلی تک پہنچ چکا تھا، اور وہ سلطنت مغلیہ میں شریک غالب کی حیثیت اختیار کرتے جا رہے تھے۔ اس کے علاوہ مرہٹوں اور روہیلوں کی شورشیں اور ہنگامے، حکمران دہلی کو بد حواس کرنے کے لئے کافی تھے، انہی دنوں غلام قادر سکھوں کی مدد سے بڑی طاقت پکڑ گیا اور آخرکار اس نے لال قلعے والوں کے ساتھ جس سفاکی اور درندگی کا سلوک کیا وہ تاریخ کا ایک خونین ورق ہے، اس تنگ تقلب روہیلے نے اخلاق اور انسانیت کے تمام تقاضوں کو بالائے طاق رکھ کر خاندان تیموریہ کے ساتھ انتہائی وحشیانہ سلوک کیا، سونے اور چاندی کے خزانوں کی ہوس میں اس نے شاہ عالم کی آنکھیں نکال لیں اس کی چھاتی پر سوار ہو کر بیٹھا اور پھر اسے ٹھوکریں ماریں، شہزادوں اور شہزادیوں کو کوڑے لگوائے گئے اور انہیں ناچنے پر مجبور کیا گیا، شہزادوں کو ایک ایسا بھی موقع ملا کہ وہ غلام قادر کا کام تمام کر سکتے تھے، لیکن اب ان کے جسموں میں مغلیہ خون کی گردش سست پڑ چکی تھی ——— اور اپنی عزت وناموس کو بچانے کے لئے بھی ان کا ہاتھ تلوار کی طرف نہ بڑھ سکا ——— بقول اقبال ع

حمیت نام ہے جس کا گئی تیمور کے گھر سے

غلام قادر خود کہتا تھا کہ "میں خدا کا قہر ہوں جو تم لوگوں کی بداعمالیوں کی وجہ سے تم پر نازل ہوا ہے۔"

نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے پے در پے حملوں میں دلی کا سہاگ کئی بار لٹا، مرہٹوں کی لوٹ مار تو ہمیشہ ہی جاری رہتی تھی، مغلیہ خاندان کے جانشینوں یہ حال زبوں سب پر اثر انداز ہوا اقتصادی بد حالی کے سبب سماجی زندگی

کا شیرازہ بھی بکھر گیا۔ غلے اور اشیائے ضرورت کی گرانی بڑھ گئی اور عام انسان کے لئے زندگی ایک سنگ گراں بن گئی، اس دور میں ڈاکوؤں اور لٹیروں کے ہاتھوں شریفوں کا جان و مال بھی محفوظ نہ رہا۔ خصوصاً مرہٹے گاؤں گاؤں لوٹ مار کرتے پھرتے تھے، اور غریب انسانوں کی زندگی اور آبرو ان کے نزدیک کھلونا تھی یہ زمانہ واقعی اتنا نازک تھا کہ بقول میر صاحب دستار سنبھالنا مشکل ہو گیا تھا بدھر شاہی خزانہ خالی تھا فوجیوں اور ملازمین سرکار کو مہینوں تنخواہ نہیں ملتی تھی، ایک زمانے تک سپاہی پیشہ لوگوں حالت اچھی رہی اور وہ اپنے گھوڑے اور تلوار کی بدولت ہر اقتدار پسند کے منظور نظر رہے لیکن جب اقتصادی بحران عالمگیر ہو تو کون اس کی زد سے محفوظ رہ سکتا ہے، آخر وہ وقت بھی آیا کہ سپاہی کو ملازمت اور گھوڑے کو دانہ ملنا مشکل ہو گیا، عسکری نظام میں گھوڑے کی اہمیت مسلّم ہے، لیکن یہ اہم گھوڑا اس حال کو پہنچ گیا تھا کہ بقول سودا :-

ہے اس قدر ضعیف کہ اڑ جائے باد سے
میخیں گر اس کے تھان کی ہو دیں نہ استوار

نہ استخواں نہ گوشت نہ کچھ اس کے پیٹ میں
دھونکے ہے دم کو اپنے کہ جوں کھال کو لہار

جب گھوڑے کا یہ رنگ ہو تو سپاہی کا بھی یقیناً یہی حال ہوگا کہ :-

پیادے ہیں سوڈریں سر منڈ لئے نائی سے
سوار گر پڑیں سوتے میں چارپائی سے

اس دور میں شریفوں اور نجیبوں کی حالت سب سے زیادہ ابتر

تھی، افلاس اور بیکاری نے انہیں کہیں کا نہ رکھا تھا بقول انشاء:۔

نجیبوں کا عجب کچھ حال ہے اس دور میں یارو
جہاں پوچھو یہی کہتے ہیں ہم بیکار بیٹھے ہیں

نجیب زادیوں کی زبوں حالی کس درجے تک پہنچ چکی تھی اس کا حال تو دل سے سنئے۔

نجیب زادیوں کا ان دنوں ہے یہ معمول
وہ برقع سر پہ ہے جس کا قدم تلک ہے طول!
ہے ان کی گود میں لڑکا گلاب کا سا پھول
اور ان کے محسن طلب کا ہر ایک سے یہ اصول
کہ خاک پاک کی تسبیح ہے جو لیجئے مول

اور یہ حالت ان رئیسوں اور نوابوں کی تھی جو کچھ ہی دن پہلے تک دولت مند اور صاحب اقتدار تھے اور اب انقلاب زمانہ کی نیرنگیوں کا شکار ہو گئے۔

جن کے طویلے بیچ کوئی دن کی بات ہے
ہرگز عراقی و عربی کا نہ تھا شمار
اب دیکھتا ہوں میں کہ زمانے کے ہاتھ سے
موچی سے کفش پا کو گٹھاتے ہیں وہ ادھار

بلکہ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ انہیں کوئی بھیک دینے والا بھی نہ تھا

دلی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں انہیں
تھا کل تلک غرور جنہیں تاج و تخت کا

میر، سودا، درد، مصحفی، انشا اور جرأت وغیرہ کے دیوان میں بہت سے ایسے اشعار ملتے ہیں جو براہ راست اس زمانے کے تاریخی و سیاسی حالات و واقعات سے تعلق رکھتے ہیں، اس سلسلے میں سودا کا شہر آشوب ہمارے شعری ادب میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے اس کے آخری اشعار یہ ہیں : ۔

آرام سے کٹنے کا سنا تو نے کچھ احوال
جمعیت خاطر کوئی صورت ہو کہاں سے
دنیا میں تو آسودگی رکھتی ہے فقط نام
عقبےٰ میں یہ کہتا ہے کوئی اس کا نشاں ہے
سو اس پہ تیقن کسی کے دل کو نہیں ہے
یہ بات بھی گوئندہ ہی کا محض گماں ہے
یاں فکر معیشت ہے تو واں دغدغۂ حشر
آسودگی حرفیست نہ یاں ہے نہ وہاں ہے

میر کی غزلوں میں بھی ان المناک حالات کا درد و اثر موجود ہے مگر فن کے پردے میں سیاسی تاریخ کے یہ المیہ ڈرامے میر کی آنکھوں کے سامنے کھیلے گئے، انہوں نے کسی محفوظ ساحل سے اس طوفان کا نظارہ نہیں کیا بلکہ یہ موج خون ان کے سر سے گذری ہے اور وہ خود بھی گرداب بلا میں گرفتار رہے ۔

دلی میں جب معاش کی صورتیں ناپید ہوگئیں تو انہوں نے بادل ناخواستہ شجاع الدولہ کے جانشین آصف الدولہ کی دعوت پر لکھنؤ کا رخ کیا۔ لیکن وہاں بھی انہیں گوشۂ عافیت نصیب نہ ہوا، اپنی خودداری اور آشفتہ مزاجی کے سبب وہ ہمیشہ پریشان رہے، کسی حالت میں بھی وہ زمانے سے صلح کرنے پر تیار نہ تھے اور زمانہ ان کے لئے سازگار نہ بن سکا۔

انگریزوں سے لے کر مرہٹوں تک سب کی ہوس انگیز نگاہوں کا مرکز دلّی تھی، کیونکہ مغلیہ سلطنت کا تاجدار ان کی راہ میں ایک ایسا بھاری پتھر تھا جسے ہٹائے بغیر وہ اپنی منزل تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔ اس دور میں لکھنؤ نسبتاً محفوظ تھا اور وہاں کے نوابوں نے اپنی آن بان رکھنے کی خاطر شاہانہ انداز پر محفل سجا رکھی تھی، زمانے کی اس کڑی دھوپ میں لکھنؤ کی حیثیت ایک سایہ دار درخت کی سی تھی جس کی چھاؤں میں دم لینے کے لئے کئی دہلوی شعراء ادھر پہنچے ان میں میرؔ بھی تھے۔ بعض شاعروں مثلاً انشاؔ نے لکھنؤ پہنچ کر وہی رنگ اختیار کرلیا جو لکھنؤ والوں کو مرغوب تھا، لیکن میرؔ اپنا مزاج بھی ساتھ ہی لے گئے تھے اور کسی قیمت پر اپنی انفرادیت بیچنے کو تیار نہ ہوتے بلکہ ان کی نظر میں دلی کا خرابہ لکھنؤ کی بزم آرائیوں سے بہتر تھا۔

خرابہ دلّی کا وہ چند بہتر لکھنؤ سے تھا

وہیں میں کاش مر جاتا سراسیمہ نہ آتا یاں

اس تاریخی حقیقت سے انکار کرنا مشکل ہے کہ آصف الدولہ نے میرؔ کو نہایت عزت اور محبت کے ساتھ رکھا، خود میر صاحب نے بھی اپنی

تحریروں میں آصف الدولہ کی بڑی تعریف کی ہے، اس کا اظہار ان کے متعدد قصیدوں اور شکارناموں میں بھی پایا جاتا ہے، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لکھنؤ کی آرائشی زندگی میر صاحب کی آزادہ اور عزلت پسند طبیعت کو راس نہیں آئی اور وہ اپنی طبع نازک کو نوابی مزاج سے ہم آہنگ نہیں کر سکے، میر صاحب کو اگرچہ بعد میں اپنی خودداری اور خودنگری کی بھاری قیمت ادا کرنی پڑی، لیکن وہ میر سوز یا انشاء بننے پر تیار نہیں ہوئے ــــ مولانا محمد حسین آزاد نے آبِ حیات میں ان کی بددماغی کے کئی قصّے لکھے ہیں جس میں ع

کچھ خواب ہے کچھ اصل ہے اور کچھ طرزِ ادا ہے

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب حالات اس قدر افسوس ناک تھے اور روزگار کے راستے مسدود نظر آ رہے تھے تو میر صاحب نے کسی قدر زمانہ شناسی اور موقع پرستی سے کام کیوں نہیں لیا؟ کیا وہ اپنی عظمت کے سامنے شاہانِ اودھ کو ہیچ سمجھتے تھے یا وہ درباداری کے لوازمات سے ناآشنا تھے، اگر ایسا تھا تو لکھنؤ جانے کی کیا ضرورت تھی، اس سوال کا جواب ہمیں ان کی سیرت اور کردار کے مطالعے سے مل سکتا ہے، شاید وہ اپنے مزاج سے مجبور تھے، غالباً دلی کے ساتھ ان کے دل کی دنیا بھی اجڑ چکی تھی اور وہ اپنی تمناؤں کی لاش اٹھائے ادھر سے ادھر پھر رہے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ اس زندگی میں ان خواہشوں کی تکمیل نہیں ہو سکتی

مرگ اک ماندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

صبر و قناعت اور فقر و غنا کی دولت انہیں اپنے درویش صفت باپ اور منہ بولے چچا سے ورثے میں ملی تھی، شاید روحانی عظمت کا احساس اور عام لوگوں سے کسی قدر الگ تھلگ رہنے کا خیال بھی انہی بزرگوں کی صحبت میں پیدا ہوا ہو ـــــــ کسی کے عشق میں دیدہ و دل کا خون کرنا بھی اُن ہی کی تعلیم کا اثر معلوم ہوتا ہے، بہر حال میرؔ کے مزاج کے مخصوص عناصر کے سرچشمے تلاش کرنے کے لئے ہمیں میرؔ کی زندگی کی کتاب کھولنی چاہیئے کیونکہ شاعری تو شخصیت کے اظہار کا خوبصورت ذریعہ ہے اور یہ اظہار سلیقے سے ہو جاتے تو فن کہلاتا ہے۔

کیا تھا شعر کو پردہ سخن کا
سو اب ٹھہرا یہی ہے فن ہمارا

میرؔ کی زندگی

میر تقی میرؔ ۱۷۲۲ء میں آگرہ میں پیدا ہوئے، رام بابو سکسینہ اور مولوی عبدالحق نے ۱۷۱۲ء لکھا ہے لیکن خواجہ احمد فاروقی نے ۱۷۲۲ء کو صحیح ثابت کیا ہے، میرؔ کے والد علی متقی انتہائی پاک باز، پرہیزگار، روشن ضمیر اور اللہ والے بزرگ تھے، انہوں نے ریاضت اور نفس کشی کی بدولت عشق و عرفان کی منزلیں طے کی تھیں اُن پر اکثر جذب و مستی کا عالم طاری رہتا ـــــــ مکروہات دنیا سے انہیں کوئی تعلق نہ تھا، امیر و غریب سب ان سے گہری عقیدت رکھتے تھے اور ان کی ملاقات اپنے لئے باعث سعادت جانتے تھے، لیکن علی متقی اس دنیا کے انسان نہ تھے، وہ روحانی کیف و سرور کی دنیا میں کھوئے رہتے "طبیعتش مشکل پسند، جانش دردمند، مژگانِ نم، حالِ درہم" کبھی کبھی ان پر

رقت طاری ہو جاتی اور وہ دیر تک روتے رہتے، میر نے لکھا ہے کہ "از بس گریستے وگریہ اش درگلو گرہ گشتے"۔ "اُس شب زندہ دار اور روز حیراں کار" بزرگ کے دامن تربیت میں میں میر کا بچپن گذرا، وہ میر کو قناعت، خودداری، کم آمیزی اور عشق بازی کی تعلیم و تلقین کرتے   میر بھی آخر اسی کامل فقیر کے بیٹے تھے، ان کے دل میں بھی عشق کی چنگاریاں موجود تھیں، خود میر کا بیان ہے کہ جب کبھی وہ مجھے گلے لگاتے تو کہتے، "اے جانِ پدر! یہ کیسی آگ ہے جو تیرے سینے میں چھپی ہے اور یہ کیسا سوز تیری جان کے ساتھ لگا ہوا ہے"۔ کبھی تلقین فرماتے تو کہتے "بیٹا عشق اختیار کرو۔۔ ۔۔ ۔۔ بے عشق زندگانی وبال ہے اور عشق میں دل کھونا اصل کمال ہے، عشق بساز و عشق بسوز، عالم میں جو کچھ ہے وہ عشق ہی کا ظہور ہے"

علی متقی میں عاشقانہ جلال و جمال کے تمام اوصاف موجود تھے، ان کی آنکھوں میں چمک اور مقناطیسی کشش تھی، ان کی ایک نظر التفات دلوں کی دنیا بدل دیتی۔ میر امان اللہ کا مختصر تعارف یہی ہے کہ وہ اس درویش کامل کی نظر پڑتے ہی ہمیشہ کے لئے حلقہ بگوش ہو گئے، اپنا گھر بار چھوڑ کر پیر و مرشد کے آستانے پر دستک دی اور پھر وہیں کے ہو گئے، علی متقی انہیں اپنے بھائی کی طرح جانتے اور مانتے تھے، اور میر کو انہی کی آغوش تربیت میں دے دیا، وہ بھی میر کو اولاد کی طرح چاہتے، میر نے اپنے اس منہ بولے چچا کو ہر جگہ "عم بزرگوار" کے نام سے یاد کیا ہے   باپ ایسا ہو اور چچا ایسا تو بیٹے کا کیا حال ہوگا، علی متقی کی تلقین عشق   اور امان اللہ کی گرمیٔ محبت سے میر کی طبیعت دو آتشہ ہو گئی اور یہ آگ ہمیشہ ان کے سینے میں سلگتی رہی

ہمیشہ چشم ہے نمناک، ہاتھ دل پر ہے
خدا کسو کو نہ ہم سا بھی دردمند کرے

میر تقی میر اکثر امان اللہ کے ساتھ رہتے اور درویشوں اور صوفیوں کی محفلوں میں بیٹھتے، دنیادار لوگوں سے ان کے رابطے بہت کم تھے، بزرگ باپ کے بیٹے ہونے کے سبب بچپن میں بھی ان کی بڑی عزت تھی اور بڑے لوگ بھی درویش زادے کا احترام کرتے تھے ـــــ جن فقیروں اور صوفیوں سے امان اللہ ملنے جاتے تھے ان میں ایک بزرگ احسان اللہ تھے، وہ بیخودی اور جذب و مستی کے عالم میں رہتے اور جب کوئی ان کے تکیے پر جاتا اور آواز دیتا تو وہ خود ہی اندر سے فرماتے کہ "احسان اللہ گھر میں نہیں ہے"۔ معلوم ہوتا ہے کہ میر کو ان کی یہ ادا بہت بھاتی تھی کیونکہ میر کے بعض اشعار میں اس درویش کی صدائے بازگشت سنی جا سکتی ہے:۔

مسکن جہاں تھا دل زدہ مسکیں کا ہم تو واں
کل دیر میں میر پکارے کہاں ہے اب؟

میر کی عمر دس گیارہ برس کی تھی کہ بزرگ باپ اور "عم بزرگوار" دونوں کا انتقال ہو گیا اور میر کو اس دنیا کا مقابلہ کرنا پڑا جس کا انہیں کوئی تجربہ نہ تھا، صوفی کی خانقاہ کے باہر کی آب و ہوا بالکل مختلف تھی، ان کے سوتیلے بھائی محمد حسن نے بھی بے رخی سے کام لیا، اس لئے باپ کی آنکھ بند ہوتے ہی انہیں روٹی کی فکر دامن گیر ہو گئی اور وہ آخر کار دلی پہنچے دلی میں تو روزگار کے ہزار مواقع نکل سکتے تھے لیکن یہ شاہجہاں کی دلی نہ تھی بلکہ محمد شاہ کی دلی تھی، میر کی زندگی کی طرح اجڑی اور لٹی ہوئی بستی، سیاسی اور معاشرتی زندگی میں انتشار تھا، پھر نادر شاہی حملہ، زندگی مصیبتوں کا طوفان بن گئی، حد یہ ہے کہ درد جیسا گوشہ

نشین شاعر بھی چیخ اٹھا۔

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے

ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

ان حالات میں روزگار کا کوئی ایسا انتظام نہ ہو سکا جسے تسلی بخش کہا جا سکے بہر حال عارضی طور پر گذر بسر کا سامان پیدا ہو گیا۔ لیکن جب حالات اور سنگین ہو گئے تو اپنے آبائی شہر آگرہ چلے گئے، اس وقت میر کی عمر سولہ سترہ برس کی ہوگی، بچپن میں باپ نے عشق بازی کی تلقین کی تھی لیکن شاید علی متقی کی نظر میں عشق کا تصور خالص روحانی تھا، میر درویشوں کی خانقاہ سے الگ ہونے کے بعد اس روحانی دولت سے محروم ہو گئے تھے تاہم عشق کا جذبہ ابھی سرد نہیں پڑا تھا اور باپ کا پڑھایا ہوا سبق یاد تھا چنانچہ ایک تذکرہ نویس کا بیان ہے

"بہ شہر خویش با پری تمثالے کہ از عزیزانش بود، در پردہ تعشق و میل خاطر داشت آخر عشق او خامہ مشک پیدا کردہ ...."

اس محبت میں انہیں رسوائی اور ناکامی کا سامنا کرنا پڑا، عزیزوں اور رشتہ داروں نے شایان کی اس جرأت رندانہ کو پسند نہیں کیا اور در پے آزار ہو گئے میر معاشی طور پر پہلے ہی بے حال تھے، اس صدمے نے انہیں سودائی اور راندۂ درگاہ بنا دیا، کچھ دنوں بعد اکبر آباد کی زمین میر کے لئے تنگ ہو گئی اور وہ دیار یار چھوڑنے پر مجبور ہو گئے، لیکن جوش جنوں میں کمی نہ آئی اور عشق نے وحشت کا رنگ ایسا پکڑا کہ انہیں اپنے محبوب کا عکس چاند میں نظر آنے لگا ——— مثنوی خواب و خیال میں میر لکھتے ہیں :-

چلا اکبر آباد سے جس گھڑی
در و بام پر چشمِ حسرت پڑی

کہ ترکِ وطن پہلے کیوں کر کروں
مگر ہر قدم دل کو پتھر کروں

پس از قطع رہ لائے دلّی میں بخت
بہت کھینچے یاں میں نے آزار سخت

جگر جورِ گردوں سے خوں ہو گیا
مجھے رفتہ رفتہ جنوں ہو گیا

ہوا خبط سے مجھ کو ربطِ تمام
لگی رہنے وحشت مجھے صبح و شام

نظر آئی اک شکل مہتاب میں
کمی آئی جس سے خور و خواب میں

وہی جلوہ ہر آن کے ساتھ تھا
تصور مری جان کے ساتھ تھا

کہیں ٹک تسلّی کہیں بے قرار
کہیں شوق سے میرے بے اختیار

کہیں واسطے میرے روتی ہی خوں
کہیں دست زیرِ زنخ بے ستوں

کہیں دل برِ دل وہ رشکِ قمر
کہیں حسرت آلود مجھ پہ نظر

کہیں چشمِ گریاں سے دامان چاک
کہیں سو جگہ سے گریبان چاک

کہیں مجھ سے کہتی ہے رخصت مجھے
کہ مطلق نہیں غم کی طاقت مجھے

کبھی بیقراری ہے اس رنگ سے
کہ پھرتی ہے سر مارتی سنگ سے

کبھی یہ سخن جس سے ہو مستفاد
کہ لے بے وفا حرف من یاد باد

کہ ظاہر میں میرؔ اب تو آنا گیا
کہ وہ دوستی کا زمانہ گیا

اُن کی اس دیوانگی اور وحشت کا قصہ "ذکرِ میرؔ" میں بھی موجود ہے
میرؔ لکھتے ہیں "در شب ماہ پیکرے خوش صورت با کمال خوبی از جرمِ قمر انداز طرفِ من می کرد و موجبِ بے خودی می شد، ہر طرف کہ چشم می افتاد بر آں رشک پری می افتاد، ہر جا کہ نگاہ می کردم تماشائے آں غیرت حور می کردم ..... تمام سوز جنوں می کردم، دل دریا داو خوں کردم"

دل گیا رُسوا ہوئے آخر کو سودا ہو گیا!
اس دو روزہ زیست میں ہم پر بھی کیا کیا ہو گیا

میر تقی میر جب ۱۱۵۱ھ دہلی پہنچے تو ایک عرصے تک سراج الدین خان آرزو کے یہاں رہے جو رشتے میں ان کے سوتیلے ماموں تھے وہ شاہی دربار کے منصب دار اور جاگیردار تھے، خان آرزو اس دور کی عظیم شخصیتوں میں تھے، وہ علم و فضل، سخندانی اور سخن سنجی میں یکتائے زمانہ تھے اور میر نے ان کی صحبت میں بہت کچھ حاصل کیا   خان آرزو شعر کا نہ صرف اعلیٰ ذوق رکھتے تھے بلکہ خود بھی فارسی کے قادر الکلام شاعر تھے، کبھی کبھی ریختہ بھی کہتے، اردو کلام کا نمونہ یہ ہے:-

آتا ہے صبح اٹھ کر تیری برابری کو
کیا دن لگے ہیں دیکھو خورشید خاوری کو

دل مارنے کا نسخہ پہنچا ہے عاشقوں تک
کیا کوئی جانتا ہے اس کیمیا گری کو

اب خواب میں ہم اس کی صورت کو ہیں ترستے
اے آرزو ہوا کیا بختوں کی یاوری کو

میر نے نکات الشعراء میں خان آرزو کے متعلق لکھا ہے:-

"شاعر زبردست، قادر سخن، عالم فاضل تا حال ہمچو الیشاں بہ ہندوستان جنت نشان ہم نہ رسیدہ، بلکہ بحث در ایران می رود..... گاہے برائے تفنن طبع دو سہ شعر ریختہ فرمودہ ایں بے اعتبار را کہ اختیار کردہ اہم اعتبار دادہ اند۔"

کہا جاتا ہے کہ خان آرزو ایک عرصے کے بعد بعض وجوہات کی بنا پر میر سے کشیدہ خاطر رہنے لگے اور آخر میر کو ان سے قطع تعلق کرنا پڑا ۔۔۔ تاہم جہاں

تک ذوق کی تربیت اور ذہن کی پرورش کا تعلق ہے خان آرزو کے احسانات میر پر بہت ہیں اور بہ بدسلوکی کے الزام کے باوجود ہمیں خان آرزو کی میر پروری سے انکار نہیں کرنا چاہیئے، میر کی بے دماغی اور عشق بازی کے معاملات کو بھی ذہن میں رکھا جائے تو خان آرزو کی خفگی اور کشیدگی کا جواز تلاش کیا جا سکتا ہے، بہرحال خان آرزو نے میر کو بہت کچھ دیا البتہ سکون قلب کی دولت نہ دے سکے اور میر بدستور زمانے کی گردشوں کا شکار رہے، خان آرزو بھی شجاع الدولہ کی دعوت پر لکھنؤ چلے گئے اور وہیں انتقال کیا۔

یہ زمانہ سیاسی اعتبار سے انتہائی انقلاب آفریں تھا، نادر شاہ کے قتل عام اور احمد شاہ کے حملوں کے بعد سے دلی اور دلی والوں پر کیسی کیسی قیامتیں ٹوٹیں اور کیا کیا انقلاب دیکھنے پڑے، زندگی کا شیرازہ بکھر گیا، بیکاری اور مہنگائی کے اس دور میں شریفانہ زندگی بسر کرنے کے تمام ذرائع مسدود ہو گئے، ہر شخص حاجتمند تھا کون کس کی حاجت روائی کرتا میر نے اپنے "شہر آشوب" میں بڑی تفصیل سے ان حالات کا ذکر کیا ہے۔

مرنے کے مرتبے ہیں ہیں اسباب جو تھا سا ملا سو ہے اسباب
تنگدستی سے سب بحال خراب جسکے ہے یال تو نہیں ہے طناب
جس کے ہے فرش تو نہیں فراش

زندگانی ہوتی ہے سب پہ وبال کنجڑے جھینکیں ہیں روتے ہیں بقال
پوچھ مت کچھ سپاہیوں کا حال ایک تلوار بیچے ہے اک ڈھال
بادشاہ و وزیر سب قلاش

اس پر آشوب دور میں سماجی اور اخلاقی قدریں بھی بدلنے لگیں، رئیسوں کی وضع داری اور شریفوں کی خودداری قائم نہ رہ سکی، انسان کو جب نان شبینہ میسر نہ آئے تو قناعت پسندی کا بھرم کب تک قائم رہ سکتا ہے، میر کی خودداری پر بھی حالات نے کاری ضرب لگائی، انہوں نے کئی نوابوں اور رئیسوں (مثلاً نواب بہادر خان، راجہ جگل کشور اور راجہ ناگرمل) کے احسانات برداشت کئے اور ان کی قدردانی کو اپنی خوش بختی سے تعبیر کیا لیکن قدرت نے میر کو جو قلندرانہ مزاج عطا کیا تھا وہ اس کے خلاف برابر احتجاج کرتا رہا خود میر کی زبان سے سنئے۔

جانا جہاں نہ تھا مجھے سو بار واں گیا
ضعف تو سے کے دست بد بوار واں گیا

محتاج ہو کے ناں کا طلب گار واں گیا
چارہ نہ دیکھا مضطر و ناچار واں گیا

اس جانِ ناتواں پہ کیا صبر اختیار

در پہ ہر اک دنی کے سماجت مری گئی!
نالائقوں سے ملنے لیا قت مری گئی!

کیا مفت ہاتھ سے شانِ شرافت مری گئی
ایسا پھرایا ان نے کہ طاقت مری گئی

مشہور شہر اب ہوں سبکسار و بے وقار

حالت تو یہ کہ مجھ کو غموں سے نہیں فراغ
دل سوزشِ درونی سے جلتا ہے جوں چراغ

سینہ تمام چاک ہے سارا جگر ہے داغ
ہے نام مجلسوں میں مرا میرؔ بے دماغ
از بسکہ بے دماغی نے پایا ہے اشتہار

میرؔ معاشی مشکلات کے سبب بے حد "پراگندہ دل" ہو چکے تھے، اور جو ملہ شکن حالات کی تاب نہ لاکر خانہ نشین ہو گئے تھے کہ لکھنؤ سے نواب اودھ آصف الدولہ نے انہیں بلا بھیجا ان دنوں آصف الدولہ کی سخاوت، اور دریا دلی اور میرؔ کی دل گداز شاعری دونوں کی بڑی دھوم تھی، میرؔ نے اس قدر ـــــــ دلی کو نعمت غیر مترقبہ جانا اور لکھنؤ کے لئے رخت سفر باندھ لیا ـــ لکھنؤ جانے کا قصہ میرؔ نے یوں بیان کیا ہے۔ "اس زمانے میں فقیر خانہ نشین تھا، اور چاہتا تھا کہ شہر سے نکل جائے لیکن بے سامانی کی وجہ سے معذور تھا، میری عزت وآبرو کی حفاظت کے لئے نواب وزیر الملک آصف الدولہ بہادر آصف الملک کے دل میں خیال آیا کہ میرؔ میرے پاس چلا آئے تو اچھا ہو، میری طلبی کے لئے نواب سالار جنگ پسر اسحاق خان موتمن الدولہ اور نواب اسحاق خان نجم الدولہ خان کے چھوٹے بھائی نے جو وزیر اعظم کے خالو ہوتے تھے، ان قدیم تعلقات کی وجہ سے جو میرے سوتیلے ماموں کے ساتھ تھے، کہا اگر نواب صاحب اندراہ کرم کچھ زاد راہ عنایت فرمائیں تو البتہ میر صاحب یہاں آسکتے ہیں، نواب صاحب نے حکم دیا اور انہوں نے سرکار سے زادِ راہ لے کر مجھے خط لکھا کہ نواب صاحب یاد فرماتے ہیں جس طرح ہوسکے یہاں آجائیے میں پہلے ہی سے دل برداشتہ بیٹھا تھا خط آتے ہی لکھنؤ روانہ ہو گیا" یہ واقعہ ۱۱۹۶ھ کا ہے۔ خود میرؔ کی اس تحریر کی روشنی میں مولانا آزاد کا یہ بیان بڑا

عجیب معلوم ہوتا ہے کہ جب تیر لکھنؤ کے لئے روانہ ہوئے تو ساری گاڑی کا کرایہ بھی پاس نہ تھا مجبوراً ایک آدمی کے ساتھ شریک ہو گئے، اپنی زبان خراب ہونے کے خیال سے راستے بھر اس سے بات چیت نہیں کی اور لکھنؤ پہنچ کر عام مسافروں کی طرح ایک سرائے میں ٹھہرے اس کے آگے کا قصہ خاصا دل چسپ اور اثر انگیز ہے، اس لئے مولانا آزاد کی زبان سے سننے میں زیادہ مزہ آئے گا، فرماتے ہیں:

"لکھنؤ پہنچ کر جیسا کہ مسافروں کا دستور ہے ایک سرا میں اترے، معلوم ہوا کہ آج یہاں ایک جگہ مشاعرہ ہے ـــــ اسی وقت غزل لکھی اور مشاعرے میں جا کر شریک ہوئے، ان کی وضع قدیمانہ، کھڑکی دار پگڑی، پچاس گز کے گھیر کا پاجامہ، ایک پورا تھان پستولئے کا کمر سے بندھا، ایک رومال پٹری دار تہ کیا ہوا، اس میں آویزاں مشروع کا پاجامہ جس کی عرض کے پائنچے، ناگ پھنی کی انی دار جوتی جس کی ڈیڑھ بالشت اونچی نوک، کمر میں ایک طرف سیف یعنی سیدھی تلوار، دوسری طرف کٹار، ہاتھ میں جریب، غرض جب داخل محفل ہوئے تو وہ شہر لکھنؤ، نئے انداز، نئی تراشیں، بانکے ٹیڑھے جوان جمع ـــــ انہیں دیکھ کر سب ہنسنے لگے۔ میر صاحب بیچارے غریب الوطن، زمانے کے ہاتھ پہلے ہی دل شکستہ اور بھی تنگ دل ہوئے اور ایک طرف بیٹھ گئے۔ شمع ان کے سامنے آئی تو پھر سب کی نظر پڑی اور بعض اشخاص نے پوچھا کہ حضور کا وطن کہاں ہے میر صاحب نے یہ قطعہ فی البدیہہ کہہ کر غزل طرحی میں داخل کیا:۔

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو　　ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب　　رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
اس کو فلک نے لوٹ کے ویران کر دیا　　ہم رہنے والے ہیں اسی اُجڑے دیار کے

سب کو حال معلوم ہوا بہت معذرت کی اور میر صاحب سے عفو تقصیر چاہی، کمال کے طالب تھے، صبح ہوتے ہوتے شہر میں مشہور ہو گیا کہ میر صاحب تشریف لائے ہیں"   اس واقعہ کی تاریخی صحت کسی قدر مشکوک ہے لیکن آزاد نے اس قدر دل کش مرقع کھینچا ہے کہ محض حسن بیان اور جزویات نگاری کے سبب اسے درست مان لینے کو جی چاہتا ہے، اول تو اس بیان کی تردید کرنا مشکل ہے اور پھر تردید کی ضرورت بھی کیا ہے۔

لکھنؤ میں آصف الدولہ نے میر صاحب کی قدردانی اور ناز برداری میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی، وہ مصاحبین خاص میں شامل تھے اور اکثر مجلسوں اور محفلوں میں نواب صاحب کے ساتھ رہتے، لیکن ملازم سرکار ہونے کے باوجود میرؔ اپنی خودپسندی، عالی دماغی اور خودداری کو قربان کرنے پر تیار نہیں ہوئے، اور دربارداری کے مسلّمہ فرائض کی بجا آوری میں تکلف اور سبکی محسوس کرتے رہے مثلاً تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا میں یہ واقعہ درج ہے کہ" جب سرکار آصف الدولہ بہادر میں میر صاحب صیغۂ شاعری میں نوکر ہوئے، ایک دن وہ آصف جاہ کتاب خانہ میں جلوہ گر تھا اور دواوین زیر و بالا رکھے تھے، ایک جلد نواب نامدار کے ہاتھ سے دور، در میر صاحب کے نزدیک تھی فرمایا "مجھے اٹھا دیجئے" میر صاحب نے ایک خادم سے کہا سنو! تمہارے آقا کیا فرماتے ہیں! نواب صاحب نے راست ہو کر اٹھا لیا مگر انہیں یہ میرزائی نہایت ناگوار گذری" مولانا آزاد نے آب حیات میں کئی اور قصے لکھے ہیں جن سے میرؔ کی تنگ مزاجی کا پتہ چلتا ہے، ہو سکتا ہے کہ میرؔ صاحب غیر شعوری طور پر احساس کمتری کا شکار رہے ہوں جو دراصل احساس برتری کی شکست کے بعد

پیدا ہوگیا تھا، سچ تو یہ ہے کہ اقتصادی مجبوری اور شاعرانہ برتری کے ملے جلے احساس نے میرؔ کو کہیں کا نہ رکھا تھا، وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ دنیا انہیں عالی نسب انسان اور عظیم شاعر کے سوا کچھ نہ سمجھے اور اسی اعتبار سے ان کی قدر و عزت کرے لیکن شاید ان کے مالی اور معاشی حالات کے پیشِ نظر زمانے نے ان کے اس نظریے کی عملی تائید نہیں کی۔

یوں تو دلی کے تاجدار ہوں یا لکھنؤ کے نواب میرؔ کے ساتھ سب کا رویہ شریفانہ رہا اور بعضوں نے حُسنِ سلوک کی تاریخیں بھی چھوڑی ہیں لیکن میرؔ کی حد سے بڑھی ہوئی انفرادیت کی خاطر اس عہد کے جاگیردارانہ نظام کو کون بدل سکتا تھا غالبؔ نے اپنے دور میں اسی شخصی نظام کے تقاضوں پر یہ کہہ کر کتنا بھرپور طنز کیا تھا،

غالبؔ وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دُعا
وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں!

بہرحال میرؔ اپنی فطرت اور بچپن کی تربیت سے مجبور تھے، وہ ٹوٹ تو سکتے تھے لیکن لچک نہیں سکتے تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بھری بزم میں خود کو تنہا محسوس کرتے اور بدقسمتی سے کوئی بھی ان کا ہم راز اور دمساز نہ بن سکا۔

تری چال ٹیڑھی تری بات روکھی
تجھے میرؔ سمجھا ہے یاں کم کسو نے!

○

اتنی بھی بد مزاجی ہر لحظہ میرؔ تم کو
الجھاؤ ہے زمیں سے جھگڑا ہے آسماں سے

انگریزوں کی تاریخ میں یہ زمانہ ہسٹنگز کا دور تھا اور ان کے اقتدار کا سورج جو جنگ پلاسی (۱۷۵۷ء) کے بعد طلوع ہوا تھا، روز بروز چڑھتا جا رہا تھا۔ انگریز حکام جہاں پہنچتے، جاگیردار اور نواب ان کی پیشوائی کے لئے پہنچتے اور ان کی خوشنودی حاصل کرنے کا سامان کرتے، میر اپنی شعر و ادب کی دنیا میں ایک ممتاز شخصیت تھے، جشن اور استقبال کے موقعوں پر انہیں نظر انداز نہیں کیا جاتا تھا، لیکن میر کو یہ بات پسند نہ تھی کہ کوئی صاحب اقتدار ان کے فن اور مرتبے کو پہچانے بغیر محض انسانی ہمدردی اور بندہ نوازی کے جذبے سے انہیں انعام و اکرام سے نوازے، دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہئے کہ وہ تحسین نا شناس کے قائل نہ تھے، چنانچہ آب حیات میں مولانا آزاد نے لکھا ہے کہ "گورنر جنرل اور اکثر صاحبان عالی شان جب لکھنؤ جاتے تو اپنی قدردانی سے یا اس سبب سے کہ ان کے میر منشی اپنے علو حوصلہ سے ایک صاحب کمال کی تقریب واجب سمجھتے تھے، میر صاحب کو ملاقات کے لئے بلاتے مگر یہ پہلو تہی کرتے اور کہتے کہ مجھ سے جو کوئی ملتا ہے تو یا تو مجھ فقیر کے خاندان کے خیال سے یا میرے کلام کے سبب ملتا ہے، صاحب کو خاندان سے غرض نہیں، میرا کلام سمجھتے نہیں، البتہ کچھ انعام دیں گے، ایسی ملاقات سے ذلت کے سوا کیا حاصل ہے؟ میر آخر اسی بے نیاز درویش کے بیٹے تھے جس نے امیر الامرا صمصام الدولہ سے ملنے سے انکار کر دیا تھا اور کہا تھا کہ میں فقیر تم امیر ملاقات کے لئے مناسبت ضروری ہے اس لئے میں معذور ہوں مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔"

آصف الدولہ کے بعد سعادت علی خاں کا زمانہ آیا جن کے دربار میں انشاء اللہ خاں انشاء (۱۷۵۶ء-۱۸۱۷ء) کو خصوصی حیثیت حاصل تھی، سعادت علی بھی میر تقی کے حالات

سے بے خبر نہیں رہے اور ان کی مدد پر آمادہ رہے۔ لیکن میر صاحب نے اپنی خودداری اور قناعت پسندی کے سبب کسی کے سامنے ہاتھ نہ پھیلایا، ان ہی دنوں (۱۸۰۰ء) میں کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج کی بنیاد پڑی تھی جہاں تصنیف وتالیف کے سلسلے میں بہت سے شاعروں اور ادیبوں کے لئے روزگار کے مواقع پیدا ہو گئے تھے، لیکن میر کے قوے اضمحل ہو چکے تھے اور پھر وہ نوکری کے تقاضے پورے بھی نہیں کر سکتے تھے، اس لئے یہ موقع بھی ان کے لئے بے معنی ثابت ہوا، میر کے دو ممتاز معاصرین یعنی مرزا محمد رفیع سودا (۱۷۸۰ء-۱۳ء) اور خواجہ میر درد (۱۷۸۴ء-۱۲۰ء) دنیا سے رخصت ہو چکے تھے، میر نے ان سے زیادہ عمر پائی، تقریباً ساٹھ برس کی عمر میں وہ لکھنؤ آئے تھے اور نوے برس کی عمر میں ۱۲۲۵ھ ۱۸۱۰ء میں انتقال ہوا، ناسخ نے تاریخ وفات کہی :-

واویلا مرد شہ شاعراں

میر کا آخری زمانہ بڑی تنگدستی اور عسرت میں گذرا لیکن انتہائی صبر آزما حالات میں بھی انہوں نے قلندری کا بھرم قائم رکھا۔

میر کے دونوں لڑکے میر عسکری عرش اور میر فیض علی فیض بھی شاعر تھے، ایک صاحبزادی تھیں جن کا تخلص بیگم بتایا جاتا ہے۔ تاریخوں اور تذکروں میں ان کے کلام کے نمونے موجود ہیں، عرش کے متعلق آزاد نے لکھا ہے کہ وہ صاحب دیوان تھے اور ان کے کئی شاگرد تھے، میر تقی میر نے اپنی وفات سے کچھ دن پہلے عرش سے کہا تھا "بیٹا ہمارے پاس مال ومتاع دنیا سے تو کوئی چیز نہیں ہے جو آئندہ تمہارے کام آئے لیکن ہمارا سرمایۂ ناز تو زبان ہے جس پر

ہماری زندگی اور عزت کا دارومدار رہا جس نے ہم کو خاک منزلت سے آسمان شہرت پر پہنچا دیا۔ اس دولت کے آگے ہم سلطنت عالم کو ہیچ سمجھتے رہے، تم کو بھی اپنے ترکے میں یہی دولت دیتے ہیں" اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عرش نے زندگی بھر اس دولت زبان کو سینے سے لگائے رکھا۔ ان کا ایک شعر بہت مشہور ہے :-

آسیا کہتی ہے ہر صبح بآواز بلند
رزق سے بھرتا ہے رزاق دہن مفلس کے!

میر نے اپنی طویل زندگی میں بہت سے بادشاہوں، نوابوں، اور شاعروں کو ابھرتے اور ڈوبتے دیکھا، انہوں نے ایک زمانہ نہیں کئی زمانے دیکھے تھے، دلی کے حکمرانوں کی بدنصیبی سے لکھنؤ کے نوابوں کی بزم آرائی تک سب ان کی نظر میں تھی، شاعروں میں انہوں نے سودا جیسے عظیم شاعر سے جرأت اور انشاء جیسے زندہ دلوں تک کو دیکھا سنا اور سمجھا تھا، تاریخ ادب میں میر کے سوا کسی اور شاعر کو زندگی اور زمانے کا اتنا ہمہ گیر تجربہ اور تفصیلی مشاہدہ کرنے کی فرصت نہیں ملی لیکن ایک اہم بات یہ ہے کہ سیاست و معاشرت کی بساط الٹنے اور سماجی قدریں کے بدلنے کے ساتھ میر خود نہ بدل سکے، البتہ خارجی اثرات ان کی شخصیت میں جذب ہوتے رہے اور اشعار میں ڈھلتے رہے۔

فن شعر سے میر کو فطری مناسبت تھی اور وہ بچپن ہی میں اشعار موزوں کرنے لگے تھے، جلد ہی ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کا اعتراف کیا جانے لگا، وہ ادبی محفلوں اور مشاعروں میں شریک ہوتے اور اپنا کلام سناتے، سراج الدین خان آرزو کی

صحبت میں میرؔ کی روشنیٔ طبع اور چمک اٹھی اور وہ سوداؔ اور دردؔ کی سطح پر طبع آزمائی کرنے لگے سعادت خاں ناصر کا بیان ہے کہ "ایک دن خان آرزو نے کہا کہ آج مرزا سودا یہ مطلع اپنا نہایت مباہات کے ساتھ پڑھ گئے۔

چمن میں صبح جو اس جنگ جو کا نام لیا
صبا نے تیغ کا آب رواں سے کام لیا

میر صاحب نے سن کر بدیہہ یہ مطلع پڑھا :

ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا
دلِ ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

میرؔ کی زبان اور بیان کی رعنائی ایسی نہ تھی کہ سخن فہم طبقہ اسے نظر انداز کر دیتا، ان کی معجز بیانی نے بڑے بڑوں سے خراجِ تحسین وصول کیا اور پھر یہ عالم ہو گیا کہ لوگ ایک شہر سے دوسرے شہر ان کی غزلیں سوغات کے طور پہ لے جاتے ـــــ میرؔ کے لکھنؤ جانے سے کافی پہلے ان کی شہرت وہاں پہنچ چکی تھی چنانچہ جب وہ لکھنؤ پہنچے تو سب نے انہیں دل میں جگہ دی ـــ بدقسمتی سے لکھنؤ کا مزاج نوابی تھا اور میرؔ کا مزاج فقیرانہ ـــــ لکھنؤ والوں نے وہ طوفان کہاں دیکھا تھا جو اہلِ دہلی کے سروں سے گذر گیا تھا ـــــ معاشرت اور مزاج کا یہی فرق تھا جس کی تشریح بعد میں دبستان دہلی اور دبستان "لکھنؤ" کے عنوان سے کی گئی اور شاعری میں داخلیت اور خارجیت کی اصطلاح میں استعمال ہونے لگیں، لکھنوی مزاج کے ترجمان انشاءؔ اور جراتؔ وغیرہ تھے اور ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کی بڑی دھوم تھی، میر صاحب جو فطری شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ تنقیدی شعور بھی رکھتے

تھے۔ اس معاملہ ہندی کو پسند نہیں کرتے تھے۔ تذکرہ کریم الدین کا واقعہ بھی خاصا مشہور ہے:

"مجلس شعراء مرزا محمد تقی خاں ترقی کے گھر منعقد ہوئی، جراءت کی بہت تعریف ہوئی، جراءت میر تقی میر سے داد خواہ اپنے اشعار کا ہوا، میر نے دو چار بار خاطر داری کی، جب دیکھا کہ منع اس کا چل نکلا ہے کہا کہ جب تم بدین جد و کد پوچھتے ہو، لاچار کہتا ہوں (میر کے مقولے کے بعینہٖ لفظ لکھتا ہوں وے یہ ہیں) کیفیت اس کی یہ ہے کہ تم شعر تو کہہ نہیں جانتے ہو اپنی چوما چاٹی کہہ لیا کرو"۔

میر کے نزدیک شاعری کے کچھ اصول اور لوازم تھے جن کی پابندی اور موجودگی ضروری تھی یہی وجہ ہے کہ شعر و ادب کی محفلوں میں اکثر اشعار پر داد و تحسین کے نعرے بلند ہوتے لیکن میر صاحب سر نہیں ہلاتے تھے —— اور میر کے سر کی ایک جنبش شاعر کے لئے سند کا درجہ رکھتی تھی —— اس طرح وہ ایک سخن فہم اور نقاد کی حیثیت سے بھی اچھی شہرت کے مالک تھے، کلیم الدین نے قدیم تذکروں اور تنقیدوں سے بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس دور کی تنقید ہی کیا تھی، سبحان اللہ اور ماشاء اللہ تک محدود تھی لیکن یہ بات ہمیں ہمیشہ ذہن میں رکھنی چاہیئے کہ سبحان اللہ کہنے والوں کے ذہن میں شعری حسن و قبح کا کوئی معیار ضرور تھا، خواہ اس کی بنیاد اخلاقی رہی ہو یا خالص فنی، میر کو اس دور کا ایک نمائندہ تصور کر لیں تو اندازہ ہوگا کہ میر صاحب کی زبان سے سبحان اللہ کہلوانا کتنا مشکل تھا کیونکہ وہ تحسین یا مروت میں داد دینے کے روادار نہ تھے، صرف سچا اور کھرا شعر ہی تحسین میر کا مستحق ہو سکتا تھا

میرؔ کا نظریۂ شاعری

میرؔ نے جس زمانے میں ہوش سنبھالا وہ شخصی حکومت اور جاگیردارانہ نظام کا دور تھا، زندگی چند طبقوں میں بٹی ہوئی تھی اور شعر و ادب کی دولت بھی چند طبقوں کے لئے مخصوص تھی، انسانوں کی تقسیم پیشے اور سماجی حیثیت کی بنیاد پر تھی، شریف اور رذیل کا تصور آج سے کافی مختلف تھا، علم و ادب کا حصول اور اس فن میں کمال پیدا کرنے کے لئے جن ذرائع کی ضرورت ہوتی ہے وہ سب کو میسر نہ تھے، میرؔ اس تمدن کے پروردہ تھے، ان کی نظر میں شاعری ایک فن شریف تھی اور فن ہمیشہ فطری صلاحیت، علمی لیاقت اور خلوص و محنت کی برکت سے حاصل ہوتا ہے، بعد میں یہ فن "جاہلوں" نے بھی اختیار کیا اور شاعری کے دعوے دار ہو گئے، مثنوی تنبیہ الجہال میں میرؔ کہتے ہیں:

ہم تلک تھی بھی وہ رسم قدیم
یعنی جن کے ہوتے تھے ذہن سلیم

پیار کرتے تھے انہیں استادِ فن
ان کے ہوتے رہبرِ راہ سخن

حلف داں زنہار پاتے تھے نہ بار
شاعری کا ہے کو تھی ان کا شعار

نکتہ پردازی سے اجلافوں کو کیا
شعر سے بزازوں ندافوں کو کیا

موشگافوں کا نہیں ہے نام اب
مدعئ شعر ہیں حجام اب

سعادت یار خان رنگینؔ نے جب میرؔ کو استاد بنانے کی خواہش ظاہر کی تو میر صاحب نے ان سے کہا تھا۔ "صاحبزادے آپ خود امیر ہیں اور امیرزادے ہیں، نیزہ بازی، تیر اندازی کی کثرت کیجئے، شہسواری کی مشق فرمایئے، شاعری دل خراشی اور جگر دوزی کا کام ہے، آپ اس کے در پے نہ ہوں۔" میرؔ کے اس نظریئے کی تائید ان کے کئی اشعار سے بھی ہوتی ہے جن میں وہ سوزِ دل اور خونِ جگر کا ذکر کرتے ہیں:-

بے سوز دل کنھوں نے کہا ریختہ تو کیا
گفتار خام پیش عزیزاں سند نہیں

○

غزل میرؔ یاں کوئی موزوں کرو
تامل کرو دل جگر خون کرو

میرؔ جانتے تھے کہ معجزہ فن کی نمود خون جگر کے بغیر نہیں ہو سکتی، غالبؔ اور اقبالؔ کا بھی یہی نظریہ ہے، فن کے متعلق میرؔ، غالبؔ اور اقبالؔ کے نظریئے میں کتنی یکسانیت ہے، اس کا اندازہ ان اشعار سے لگایا جا سکتا ہے۔

حسن فروغِ شمع سخن دور ہے اسدؔ
پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی

○

نقش ہیں سب ناتمام خون جگر کے بغیر!
نغمہ ہے سودائے خام خون جگر کے بغیر!

خونِ رگ معمار کی گرمی سے ہے تعمیر
میخانۂ حافظ ہو کہ بت خانۂ بہزاد (اقبال)

یعنی خون کی گرمی اور جذبے کی آنچ کے بغیر فن پختہ نہیں ہوتا، جب تک کوئی خلوص اور محنت کے ساتھ فن کے لئے اپنی زندگی وقف نہ کردے کمال پیدا نہیں کرسکتا، فن سے یہ وابستگی اکثر جنوں اور دیوانگی کی حد تک پہنچ جاتی ہے، ارسطو نے سچ کہا ہے کہ ہر شاہکار کے پیچھے عقل سے زیادہ جنوں کی کار فرمائی ہوتی ہے ہمارے بزرگوں کا بھی یہی مشورہ رہا ہے:

باہر کمال اندکے آشفتگی خوش است
ہر چند عقل کل شدۂ بے جنوں مباش!

○

دوانہ ہو گیا تو میر آخر ریختہ کہہ کہہ
نہ کہتا تھا میں اے ظالم کہ یہ باتیں نہیں بھلیاں

میر نے علمی لیاقت، خلوص جذبات اور سوزِ دل کے بعد جس چیز کو اہمیت دی ہے وہ سلیقہ ہے، اسی کی بدولت انہوں نے ایک منفرد شیوۂ گفتار پیدا کیا اور اردو شاعری کو نیا لب ولہجہ عطا کیا، سلیقہ کا مفہوم ان کے ذہن میں خاصا وسیع تھا، سلیقہ زندگی برتنے میں بھی اختیار کرنا چاہیئے اور قلبی واردات شعر میں پیش کرنے کے لئے بھی بڑے ہنر اور سلیقہ کی ضرورت ہوتی ہے، میر تو یہاں تک کہتے ہیں کہ "عیب کرنے کو بھی ہنر چاہیئے" کبھی کبھی شاعر کے جذبات میں صدرجے

خلوص ہوتا ہے لیکن اس کا اظہار حسن و خوبی کے ساتھ نہیں ہو پاتا، احساس کو شعر کا جسم عطا کرنا آسان بات نہیں، اس قطرے پر گہر ہونے تک جانے کیا کچھ گذرتی ہے ہنرمندی اور سلیقے کے بغیر یہ مشکل آسان نہیں ہوتی، کبھی کبھی انتہائی لطیف خیالات شاعرانہ پھوہڑپن کی وجہ سے بے جان ہو جاتے ہیں، فنّی صلاحیت اور سچی لگن نہ ہو تو دل کا جذبہ اور ذہن کا خیال شعر میں نہیں ڈھل سکتا۔

بقول میر عشق بن یہ ادب نہیں آتا، اسی لئے وہ عام لوگوں کو یہی مشورہ دیتے تھے کہ وہ شاعر بننے کی کوشش نہ کریں کیونکہ شاعری کے تقاضے پورے کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں، میر نے جان و دل کی بازی لگا کر یہ سلیقہ حاصل کیا تھا، وہ خود کہتے تھے کہ "سلیقہ ہمارا تو مشہور ہے"

صناع طرفہ ہیں ہم عالم میں ریختہ کے
گر میر جی لگے گا تو سب ہنر کریں گے

○

صناع سب ہیں خوار، ازاں جملہ ہوں میں بھی
ہے عیب بڑا اس میں جسے کچھ ہنر آوے

○

کس کس طرح سے میر نے کاٹا ہے عمر کو
اب آخر آخر آن کے یہ ریختہ کہا

○

دل کس طرح نہ کھینچیں اشعار ریختہ کے
بہتر کیا ہے میں نے اس عیب کو ہنر سے

مرے سلیقے سے میری نبھی محبت میں
تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا

○

شرط سلیقہ ہے ہر اِک امر میں
عیب بھی کرنے کو ہُنر چاہیے

"ترکیبے کہ نامانوس ریختہ می افتد، آں معیوب است و ایں
نیز موقوف بہ سلیقۂ شاعری است و مختار فقیر ہمیں است"
(نکات الشعراء)

یہی انداز باندھے ہیں یہی ناز
قیامت میر صاحب ہیں ادا بند

اپنے بلند خیالات و نظریات کے سبب وہ نالائقوں اور نااہلوں سے ہمیشہ نالاں رہے اور جب بھی کسی بر خود غلط نے زبان دانی اور شعر گوئی کا دعوےٰ کیا، میر نے اسے آڑے ہاتھوں لیا، مثنوی تنبیہ الجہال کا حوالہ پہلے آچکا ہے، میر کی دو اور مثنویاں "در ہجو نااہل مسمّی بہ زبان زد عالم" اور "در ہجو شخصے ہیچ مداں کہ دعوئے ہمہ دانی داشت" اسی قسم کی ہیں جن کے مطالعہ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ شاعری اور زبان دانی کے لئے میر کے نزدیک کیا شرطیں تھیں، اور خود اپنے بارے میں ان کی کیا رائے تھی۔

رہیو شاہد کچھ نہیں میرا گناہ
مدعی بے ہیچ ہے یہ روسیاہ

تھا تحمل مجھ کو میں درویش تھا
دردمند و عاشق و دل ریش تھا

پر کروں کیا لاعلاجی سے ہے اب
غصے کے مارے چڑھی ہے مجھ کو تپ

ایسے کتنے ہیں جو اب شاعر بنے
مدتوں یہ لونڈے آتے مجھ کنے

ایک باتوں سے مری آدم ہوا
اک نظر سے شہرۂ عالم ہوا

ایک میرے طرز پر کہنے لگا
دوسرا پیرو مرا رہنے لگا

سارے عالم پر ہوں میں چھایا ہوا
مستند ہے میرا فرمایا ہوا

ہے گی شخصیت خدا کی اور سے
ہاتھ آوے کب بزرگی زور سے

کسب جو کرتے تھے یہ فن شریف
ان میں سے کوئی نہ تھا میرا حریف

کتنے اک نو مشق تھے گرم سخن
سو بچارے آپ ہی ناگاہ فن

یاں زبردستوں کو دعوے کھا گیا
یہ چھپا رستم کہاں سے آ گیا

ہاتھی کی ٹکر کو ہاتھی ہی اٹھائے
چیونٹی کا کیا جگر جو منہ پہ آئے

یہ قبولِ خاطرِ لطفِ سخن
دے ہے کب سب کو خدائے ذوالمنن

ایک دو ہی ہوتے ہیں خوش طرز طور
اب چنانچہ میر و مرزا کا ہے دور

کلیاتِ میر میں بہت سے ایسے اشعار مل جائیں گے جو شاعری اور فن کے متعلق ان کے خیالات کا برملا اظہار کرتے ہیں لیکن ان متفرق اشعار سے کوئی مربوط نظریہ مرتب کرنا مشکل ہے۔ کہیں کہیں ان خیالات میں تضاد بھی محسوس ہوتا ہے مثلاً ایک جگہ وہ کہتے ہیں کہ شاعری ناکی دعوبی کا کام نہیں "یہ شریفوں" کا حصہ ہے، دوسری جگہ کہتے ہیں میرا روئے سخن عوام کی طرف ہے، بہرحال میر کو سمجھنا اتنا سہل بھی نہیں کیونکہ وہ ایک خاص سطح یا مقام سے بات کہتے ہیں البتہ اتنی بات تو صاف ہے کہ وہ شاعری کو ایک معزز اور محترم فن جانتے تھے، اس کے لئے علمی لیاقت، ریاضت اور دردمندی کو بنیادی شرط سمجھتے تھے

اور اگر سلیقہ بھی میسر آ جائے تو بجز جاتی ہے، ذیل کے چند اشعار سے میرؔ کے خیالات سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے:

شعر میرے ہیں گو خواص پسند
پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

سہل ہے میرؔ کو سمجھنا کیا
ہر سخن اس کا ایک مقام سے ہے

○

اک آفتِ زماں ہے یہ میرؔ عشق پیشہ
پردے میں اپنے مطلب سارے ادا کرے ہے

○

حُسن تو ہے ہی کرو لطفِ زباں بھی پیدا
میرؔ کو دیکھو کہ سب لوگ بھلا کہتے ہیں

○

میرؔ شاعر بھی زور کوئی تھا
دیکھتے ہو نہ بات کا اسلوب

○

ہیں گھاؤ دل پر اپنے تیغ زباں سے سب کی
تب درد ہے ہمارے اے میرؔ ہر سخن میں

○

میرؔ نے اپنے تذکرہ "نکات الشعراء" میں بھی ایسی باتیں کہی ہیں جن سے خود شاعری کے متعلق ان کے خیالات کا پتہ چلتا ہے، فنی لوازمات کا وہ بے حد خیال رکھتے تھے اور اس معاملے میں کسی لغزش کو برداشت نہیں کر سکتے تھے، وہ زبان اور بیان ــــ دونوں کی صحت اور خوبصورتی کے قائل تھے، اور لفظ و معنی کی ہم آہنگی کا بھی گہرا احساس رکھتے تھے ــــ نکات الشعراء میں انہوں نے بہت سے شاعروں کے کلام پر اصلاح بھی دی ہے جس سے ان کی سخن فہمی اور قادر الکلامی کا اندازہ کا اندازہ ہوتا ہے، مثلاً میرؔ نے انعام اللہ یقینؔ کا یہ شعر نقل کیا ہے ا

مجنوں کی خوش نصیبی کرتی ہے داغ مجھ کو
کیا عیش کر گیا ہے ظالم دوانہ پن میں

اس پر اصلاح دے کر میرؔ نے صرف ایک لفظ بدل دیا یعنی خوش نصیبی کے بجائے خوش معاشی کر دیا ــــ اس طرح شعر کا معنوی حسن کتنا بڑھ جاتا ہے ــــ مجنوں کی خوش معاشی کرتی ہے داغ مجھ کو

کیا عیش کر گیا ہے ظالم دوانہ پن میں

اسی طرح مصطفےٰ خاں یکرنگؔ ، کے شعر میں میرؔ نے سچ کی جگہ حق کو بہتر جانا اور لکھا کہ "باعتقاد فقیر بجائے سچ حرف حق اولےٰ است" یکرنگؔ ، کا شعر یہ ہے:

سچ کہے جو کوئی مارا جاوے
راستی ہے گی دار کی صورت

ظاہر ہے کہ یہاں حق کا استعمال زیادہ برحق ہے، اگر دار کی رعایت سے

منصور و انالحق کو بھی ذہن میں رکھا جائے تو شعر کی لفظی و معنوی خوبی بہت بڑھ جاتی ہے
بعض جگہ میرؔ نے پورا مصرع بدل دیا ہے جس کی برکت سے شعر کا مرتبہ اونچا ہو گیا
مثلاً میر سجاد کا شعر یہ ہے

عشق شیریں میں کیونکہ کاٹے گا
ہجر کی یہ پہاڑ سی راتیں

میرؔ نے پہلا مصرع بدل کر شعر کو اس طرح پیش کیا:

کس طرح کوہ کن پہ گذریں گی
ہجر کی یہ پہاڑ سی راتیں

میرؔ شاید اس حقیقت سے بھی آگاہ تھے کہ شاعری اور اس کی زبان، زندگی اور اس کی معاشرت سے گہرا رشتہ رکھے بغیر جاندار نہیں بن سکتی، درسی کتابوں سے اصولی اور بنیادی علم سیکھنا ضروری ہے لیکن زندگی کا دامن بہرحال تھامے رہنا چاہیے، شاعر کی کوئی تخلیق خلا میں سانس نہیں لے سکتی، میرؔ نے اپنی شاعری میں بہت سی چیزیں معاشرت سے داخل کی ہیں، یہی سبب ہے کہ اس عہد کی سیاسی اور تمدنی زندگی کا مطالعہ کیے بغیر میرؔ کی زبان اور مخصوص لہجے کا مزاج داں ہونا ممکن نہیں ہے، کسی موقع پر انہوں نے خود کہا تھا کہ سعدیؔ اور خاقانیؔ کی شاعری کو سمجھنے کے لئے لغت کی ضرورت ہے لیکن میرؔ کے کلام کو وہی سمجھ سکتا ہے جو جامع مسجد دلّی کی سیڑھیوں کی زبان سے واقف ہو —— میرؔ نے یہ کہہ کر ایک بنیادی حقیقت کی جانب اشارہ کیا ہے اور وہ یہی ہے کہ شعر و ادب میں زبان، محاورے اور شیوۂ گفتار سب کے رشتے ناتے زندگی کے ساتھ ہیں

نکات الشعراء کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ میر صاحب ربط کلام، جدت بیان، سادگی، تہ داری، دردمندی اور اسلوب بیان پر خاص طور سے زور دیتے تھے میر کے منتخب کلام میں یہ تمام محاسن موجود ہیں فن کے ان تمام علمی اور فنی پہلوؤں پر گہری نظر رکھنے کے ساتھ اگر انہیں اپنے "مستند" ہونے کا دعوےٰ تھا تو برحق تھا لیکن میر صاحب کے اس دعوے کو جس رنگ میں پیش کیا جاتا ہے اسے بھی سقہ بازی کی ایک خصوصیت سمجھنی چاہیئے۔ دعوے کی بنیاد میر کا یہ شعر ہے

سارے عالم پر ہوں میں چھایا ہوا

مستند ہے میرا فرمایا ہوا

مولوی عبدالحق صاحب نے لکھا ہے کہ اس شعر میں تعلی کی انتہا ہو گئی ہے کسی دوسرے شخص کی کیا مجال کہ وہ فرمانے کا لفظ اپنے لئے اس طرح سے لکھے یہ میر صاحب ہی کو زیبا تھا" حقیقت یہ ہے کہ میر نے اول تو یہ دعوے سرِبازار نہیں کیا بلکہ ان کا مخاطب ایک نااہل تھا — مثنوی "در ہجو نااہل مسمی بہ زبان زد عالم" میں جس کا اقتباس پچھلے صفحات میں دیا جا چکا ہے) میر صاحب نے اہل سخن کو مخاطب کر کے لکھا ہے کہ، دنیا میری شاعری کی قدر کرتی ہے اور سب مجھے ممتاز شاعر سمجھتے ہیں، کسی کی ہجو کرنا میرا شعار نہیں ہے، کوئی کچھ کہتا بھی ہے تو میں چپ رہتا ہوں، میں فقیر آدمی مجھے ایسے بکھیڑوں سے کیا سروکار؟ لیکن کیا کروں نااہلوں کی لاف زنی اور ہرزہ سرائی سے تنگ آگیا ہوں اور اب میں اپنے غصے کو ضبط نہیں کر سکتا اس لئے حقیقت حال عرض کرتا ہوں اور وہ یہ ہے:

ایسے کتنے ہیں جواب شاعر بنے
مدتوں آئے یہ ہونڈے مجھ کنے

ایک باتوں سے مری آدم ہوا
اک نظر سے شہرۂ عالم ہوا

ایک نے دیوان کی میرے نقل لی
اس دوانے کی کنھوں نے عقل لی

ایک میرے طرز پر کہنے لگا
دوسرا پیرو مرا رہنے لگا

سارے عالم پر ہوں میں چھایا ہوا
مستند ہے میرا فرمایا ہوا

ہجو اور جوابی کارروائی میں تو شاعروں نے دشنام طرازی اور لاف زنی کی انتہا کردی ہے، مصحفیؔ، انشاؔء اور جراتؔ کے معرکے پڑھیے اور ناسخؔ و آتشؔ کے "دیوان کے جواب" اور "قران کے جواب" پر نظر رکھیے تو میر صاحب کی یہ شاعرانہ تعلی نہایت معقول اور خوش گوار محسوس ہوگی، ایک جگہ اور میرؔ نے کہا ہے کہ "اول تو میں سند ہوں پھر یہ مری زبان ہے" اس کا مفہوم یہی ہے کہ وہ اہل زبان ہونے کے ساتھ ساتھ صاحب علم اور ماہر فن بھی تھے، میرؔ کے دور میں اکثر شعرا فارسی مصدروں اور محاوروں کا براہ راست ترجمہ کرلیتے تھے اس بات کے پیش نظر بھی لفظ "زمانے" میں شاید فخر و برتری کا اتنا احساس نہ ہوتا ہو جتنا اب ہوتا ہے، اتنی بات تو درست ہے کہ میر صاحب دماغ اور خودشناس شاعر تھے اس لئے ان کے زمانے پر

ہمیں چونکنے کی ضرورت نہیں ہے، اسی مضمون کا میرؔ کا ایک فارسی شعر موجود ہے، جو حقیقت کا صحیح طور پر انکشاف کرتا ہے اور یہ شعر ہماری توجہ کا زیادہ مستحق ہے:۔

خودستائی خودسری معیوب می دانیم ما
ورنہ طرز شعر گفتن خوب می دانیم ما

میرؔ کی غزل اور ان کا فن

میرؔ کی زندگی اور زمانہ دونوں پُر آشوب تھے، ان دونوں پاٹوں کے بیچ میں ان کی انفرادیت پسند شخصیت اور نازک مزاج شاعری کا نشوونما ہوا، اگر میر صاحب حوصلہ مند اور سخت جان نہ ہوتے تو اس بھیانک آندھی میں شاعری اور شخصیت دونوں کا چراغ گل ہو جاتا ۔۔۔ یہ سیاسی اعتبار سے شورش انگیزی اور طوائف الملوکی کا زمانہ تھا، نادر شاہ کے حملے اور محمد شاہی دور کی عیش پسندی سے غلام قادر روہیلہ کے مظالم تک انتشار و انقلاب کی ایک عبرت ناک کہانی ہے، میرؔ نے دیکھا کہ سلطنت مغلیہ کا جاہ و جلال کس طرح مٹی میں مل گیا، تہذیب و تمدن نے کیا رنگ۔ روپ اختیار کئے اخلاقی قدروں کا کیا حشر ہوا اور ہنستی مسکراتی زندگی اور اس کی شاداب تمنائیں کس طرح فنا ہو گئیں، یہ مشاہدہ دنیا کی بے ثباتی اور زندگی کی بے مائگی کا وہی احساس پیدا کرتی ہے جس طرف شوپن ہار کا اشارہ ہے یعنی زندگی مستقل غم ہے

یاں کے سفید و سیاہ میں ہم کو دخل جو ہے سو اتنا ہے
رات کو رو رو صبح کیا اور دن کو جوں توں شام کیا

میر صاحب زمانہ نازک ہے
دونوں ہاتھوں سے تھامیئے دستار

○

شہاں کہ کحل جواہر تھی خاک پا ان کی
انہی کی آنکھوں میں پھرتے سلائیاں دیکھیں

○

دلی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں انہیں
تھا کل تلک دماغ جنہیں تاج و تخت کا

○

رکھے تاج زر کو سر پر چمن زمانہ میں گل
نہ شگفتہ ہو تو اتنا کہ خزاں ہے یہ بہاراں
نہیں تجھ کو چشم عبرت یہ نمود میں ہے ورنہ
کہ گئے ہیں خاک میں مل کئی تجھ سے تاج والاں

میرؔ نے خارجی ماحول کی عکاسی، گہرے فنی شعور کے ساتھ کی ہے، انہوں اپنے گردوپیش کے حالات سے جو اثر لیا اسے اپنی شخصیت کا جزو بنا کر غزل کے پردے میں ظاہر کیا، انفرادی اور اجتماعی شعور کا امتزاج اس قدر فنکارانہ انداز میں ہوا ہے کہ ذات و کائنات کا فرق باقی نہیں، انہوں نے اپنی زندگی اور زمانے کی بے قراریوں کو لفظوں میں اسیر کر لیا، ان کی شاعری اس پُر آشوب دور کی مدح

ہے جو بے چین گھومتی ہے اور جسے دردمند پاتی ہے اپنا دکھ سنانے بیٹھ جاتی ہے
ان کا غم رسمی اور روایتی نہیں بلکہ آپ بیتی اور جگ بیتی ہے، اسی لئے ان کی شاعری
محض سخن پروری یا قافیہ پیمائی نہیں ہے بلکہ معنی آفرینی کی سرحدوں کو بھی پار کر گئی ہے،
ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے لکھا ہے کہ "میرؔ کا زمانہ سیاسی، سماجی اور ذہنی انتشار کا
تھا لیکن دار وگیر کا بھی تھا، شخصی آزادی کا تصور، یا تحریر و تقریر کی آزادی کے نعرے اس
وقت تک بلند نہیں ہوتے تھے، پاسبان کا ڈر اور محتسب کا کھٹکا ہر وقت لگا
رہتا تھا، یہی وجہ ہے کہ اس عہد کی غزل میں جگہ جگہ کچھ گھٹن سی محسوس ہوتی ہے اور
بار بار قید، قفس، صید، صیاد، دام، زنجیر، حلقۂ زنجیر، زندان یوسف اور اسی قسم کے
مضامین آتے ہیں" شاعروں نے خارجی ماحول کو اشاروں اور کنایوں میں ادا کرنے کا
فن اپنایا۔ یہی وہ شاعرانہ صفت ہے جسے اب ہم اشاریت، ایمائیت اور سمبولزم
کا نام دیتے ہیں، میرؔ کے اشعار میں یہ نازک اشاریت خارجی حقیقتوں کا سراغ لگانے
میں بہت مدد دیتی ہے، میرؔ نے چراغ مفلس، دیوار کے سائے اور اتفاقات زمانہ
کا جو ذکر کیا ہے، وہ محض شاعرانہ خیال آرائی نہیں ہے، بلکہ اس کے پس منظر میں مشاہدے
اور تجربے کی ایک دنیا موجود ہے، خود میرؔ نے بھی کہا تھا

اک آفتِ زماں ہے یہ میرؔ عشق پیشہ!
پردے میں سارے مطلب اپنے ادا کرے ہے

ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی غزلوں میں بہت سے الفاظ تاریخ و تمدن کے
دروازوں سے گذر کر شعر کی بارگاہ تک پہنچے ہیں، ان لفظوں میں گنجینۂ معنی کا طلسم
اور خارجی حالات کا احساس و اشارہ موجود ہے، شہرِ دل کی ویرانی، نگر اور بستی کا

اجڑنا، اور لشکر کا نکلنا دلی کی تباہی اور ویرانی کا براہ راست احساس دلاتے ہیں، کبھی ان کا ایک شعر معنوی اعتبار سے مکمل، شہر آشوب ہوتا ہے، میر کی غزلوں میں سیاسی اور سماجی انتشار کے اثرات جذب ہو گئے ہیں اور ہم الفاظ اور معنی کا تجزیہ کر کے خارجی حقیقتوں تک پہنچ سکتے ہیں ـــــ دنیا کے غم کو اپنا غم سمجھ کر اور اپنی ذات میں داخل کر کے میر نے فنکارانہ مہارت اور خلوص کا ثبوت دیا ہے، غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ الفاظ بھی اپنا ایک مزاج رکھتے ہیں، ان کی انفرادی اور شخصیت بھی ہوتی ہے اور وہ سیاحوں کی طرح سفر کرتے ہیں، اور مختلف آب و ہوا کے اثر سے ان کے مزاج کی خاصیتیں بدلتی رہتی ہیں، شاید دیس کو دیکھ کر وہ بھیس بدل لیتے ہیں، اور شاعر سے جن حالات میں ان کی ملاقات ہوتی ہے ان کی ترجمانی الفاظ کے مزاج سے ہو جاتی ہے مثلاً شکستگی، اور خرابی یا آبادی اور لشکر عام الفاظ ہیں لیکن یہی الفاظ جب میر کی غزلوں میں راہ پاتے ہیں تو معنی کا ایک کارواں لے کر چلتے ہیں' ان لفظوں کے معنی پہلے لغت میں موجود تھے، دلی کی سیاسی اور تمدنی زندگی کے پس منظر میں کچھ اور معنی اس میں پیدا ہو گئے اور پھر میر نے خود اپنی زندگی اور شخصیت کے متعلق سوالیں اور معنی خیز بنا دیا ـــــ الفاظ کی یہ معنویت میر کی غزلوں میں نمایاں ہے شاید اسی چیز کو میر نے تہ داری کا نام دیا ہے ۔ مثال کے طور پر ان اشعار پر توجہ دیجیے :۔

دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے

یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا

دل عجب شہر تھا خیالوں کا
لوٹا مارا ہے حسن والوں کا

○

اس کے گئے پہ دل کی خرابی نہ پوچھئے
جیسے کسی کا کوئی نگر ہو لٹا ہوا

○

دل وہ نگر نہیں کہ پھر آباد ہو سکے
پچھتاؤ گے، سنو ہو یہ بستی اُجاڑ کے

○

دیدنی ہے شکستگی دل کی
کیا عمارت غموں نے ڈھائی ہے

○

ہوگا کسی دیوار کے سائے میں پڑا میرؔ
کیا کام محبت سے اس آرام طلب کو

○

دل کی آبادی کی اس حد ہے خرابی کہ نہ پوچھ
جانا جاتا ہے کہ اس راہ سے لشکر نکلا

○

میرے تغیر حال پر مت جا
اتفاقات ہیں زمانے کے

○

شام سے کچھ بجھا سا رہتا ہے
دل ہوا ہے چراغ مفلس کا

○

کہا میں نے گل کا ہے کتنا ثبات
کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

○

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہ شیشہ گری کا

○

شہرِ دل ایک مدت اجڑا بسا غموں میں
آخر اجاڑ دینا اس کا قرار پایا

○

میرؔ کے عہد میں معاشرتی زندگی کا شیرازہ بکھرا ہوا تھا اور انتشار عالمگیر تھا، اس غم میں ذاتی دکھ، درد، مفلسی اور عشق کی دل خراش ناکامی بھی شامل ہو جائے تو زندگی سنگ گراں بن جاتی ہے، میرؔ کی جان کے لئے یہ دوگونہ عذاب قدم قدم پر موجود تھا ـــــ دلّی کے ساتھ ان کے دل کی دنیا کی بستی بھی اجڑ گئی تھی محبت کی ناکامی نے انہیں دیوانگی کی حد تک پہنچا دیا تھا، یہ سوز دروں ان کی رگ و پے میں سرایت کر گیا اور درد کش صفت باپ کا دردمند دل رکھنے والا یہ بیٹا بے خودی اور خود فراموشی کی دنیا میں داخل ہو گیا۔

بے خودی لے گئی کہاں ہم کو
دیر سے انتظار ہے اپنا

○

مصائب اور تھے پر دل کا جانا
عجب اک سانحہ سا ہو گیا ہے

میرؔ کو خدا نے انتہائی حساس دل عطا کیا تھا، عشق کی گرمی سے یہ آبگینہ اور پگھل گیا، ان کی باتوں میں اداسی اور رقّت پیدا ہو گئی، انہوں نے جس محبوب کی خاطر جان و دل کی بازی لگائی تھی وہ ان کا نہ بن سکا اور میرؔ غم محبوب کی اس دولت بیدار کو سینے سے لگائے اپنی تمنا دل پر مرثیہ خوانی کرتے رہے یہ نوحہ گری انہوں نے فارسی یا اردو شاعری کی روایات سے نہیں سیکھی نہ یہ کسی خیالی محبوب کا خیالی غم ہے، یہ غم ان کا اپنا غم ہے، جو زندگی بھر ان کے ساتھ رہا، دکھ درد کے اس جذبے میں بھلا خلوص اور سچائی کی کمی کیوں کر ہو گی جو بات دل سے نکلے گی وہ دل ہی میں اترے گی، میرؔ نے اس غم کے اظہار میں لفظی لوازمات کا سہارا بھی نہیں لیا کیونکہ سیدھی سچی بات بھی حسن کلام بن سکتی ہے، میرؔ نے سو سو طرح سے غم یار کی حکایت بیان کی ہے، لیکن سادگی اور سچائی کے طفیل ان کی ہر بات ایک نیا اسلوب اور مخصوص اثر رکھتی ہے محبت کی کہانی اور عشق کی داستانوں سے کلیات میرؔ بھرا پڑا ہے، شاید اس موضوع پر اردو کے کسی اور شاعر نے اتنے شعر نہیں کہے، ظاہر ہے کہ میرؔ کو زندگی اور عشق میں جن تجربات سے گزرنا پڑا وہ اوروں کے حصے میں کہاں

آئے تھے، پھر ان کا سا سلیقہ بھی دوسروں کو نصیب نہ ہو سکا، اس لئے میرؔ کا شیوۂ گفتار ان تک محدود رہا، لیکن ان کا درد ہم سب کے دلوں کا درد بن گیا

جب نام ترا لیجئے تب چشم بھر آوے
اس زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آوے

○

دل تڑپے ہے جان کھپے ہے حال جگر کا کیا ہوگا
مجنوں مجنوں لوگ کہے ہیں مجنوں کیا ہم سا ہوگا

○

پاس ناموس عشق تھا ورنہ
کتنے آنسو پلک تلک آئے تھے

○

وصل اس کا خدا نصیب کرے
میرؔ جی چاہتا ہے کیا کیا کچھ

○

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماریٔ دل نے آخر کام تمام کیا

عہد جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند
یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا

عشق ہمارے خیال پڑا ہے خواب گیا آرام گیا
دل کا جانا ٹھہر گیا ہے صبح گیا یا شام گیا

○

جھٹ پٹا وقت ہے بہتا ہوا دریا ٹھہرا
صبح سے شام ہوئی دل نہ ہمارا ٹھہرا

○

ملنے لگے ہو دیر دیر دیکھیے کیا ہے کیا نہیں
تم تو کرو ہو صاحبی بندے میں کچھ رہا نہیں

○

پھرتے ہیں میرؔ خوار کوئی پوچھتا نہیں
اس عاشقی میں عزت سادات بھی گئی

○

یہ جو چشم پر آب ہیں دونوں
ایک خانہ خراب ہیں دونوں

ایک سب آگ ایک سب پانی
دیدہ و دل عذاب ہیں دونوں

○

یوں اُٹھے آہ اس گلی سے ہم
جیسے کوئی جہاں سے اٹھتا ہے

ہمیشہ آنکھ ہے نمناک ہاتھ دل پہ ہے
خدا کسو کو نہ ہم سا بھی درد مند کرے

یہ بیان کی سادگی اور جذبے کا خلوص میر کا اصل سرمایہ ہے، ان اشعار کی داخلیت جسے فراق گورکھپوری نے "بھیتری چوٹ" کا نام دیا ہے سننے والوں کو تڑپا دیتی ہے اور نشتر کا کام کرتی ہے، میر کے بہتر نشتروں کی روایت بھی مشہور ہے، شاعری اور تنقید نگاری میں اعداد و شمار کا استعمال کچھ ایسا مستحسن نہیں ہے تاہم کلیات میر کی اگر شعر شماری کی جائے تو ایسے نشتروں کی تعداد بہت زیادہ نکلے گی۔

میر کے ساتھ ایک اور مشکل یہ تھی کہ وہ اپنے مخصوص مزاج اور انفرادیت پسندی کے سبب کسی کو اپنا ہمدم اور ہمراز نہ بنا سکے، ان کے دل کی کہانی سننے والا شاید کوئی نہیں ملا، وہ اپنا حال اشعار میں بیان کرتے رہے اور جب غم کے ہاتھوں بہت دل گرفتہ ہوئے تو اپنی داستان غم سنانے کے لئے ایک ہمزاد تخلیق کر لیا، غزل کے مقطع میں اپنی ذات سے مخاطب ہونا یوں تو عام بات ہے لیکن میر نے جس انداز سے خود کو مخاطب کیا ہے وہ کچھ اور معنی رکھتا ہے، احساس تنہائی کے سبب ان میں خود کلامی کی عادت پیدا ہو گئی تھی اور اکثر وہ اپنے آپ سے باتیں کرتے ہیں، اس طرح انہیں دل کا حال بیان کرنے میں خاص لطف آتا ہے آیئے ہم بھی سنیں کہ میر تقی میر اپنے ہمزاد میر صاحب سے کیا کیا باتیں کرتے ہیں :

قامت خمیدہ رنگ شکستہ بدن نزار
تیرا تو میرؔ غم میں عجب حال ہو گیا!

O

لیتے ہی نام اس کا سوتے سے چونک اٹھے ہو
ہے خیر میرؔ صاحب! کچھ تم نے خواب دیکھا؟

O

نہ شکوہ شکایت نہ حرف و حکایت
کہو میرؔ جی آج کیوں ہو خفا سے!

O

از خویش رفتہ اس بن رہتا ہے میرؔ اکثر
کرتے ہو بات کس سے وہ آپ میں کہاں ہے

O

اتنی بھی بد مزاجی ہر لحظہ میرؔ تم کو
الجھاؤ ہے زمیں سے جھگڑا ہے آسماں سے

O

نازک مزاج آپ قیامت میں میرؔ جی
جوں شیشہ مرے منہ نہ لگو میں نشے میں ہوں

زیرِ فلک بھلا تو رووے ہے آپ کو میرؔ
کس کس طرح کا عالم یاں خاک ہو گیا ہے

پھرتے ہو میر صاحب سب سے جُدے جُدے تم
شاید کہیں تمہارا دل ان دنوں لگا ہے

○

احوال میر جی کا مطلق گیا نہ سمجھا
کچھ زیر لب کہا بھی سو دیر دیر رو کر

○

رات ساری تو کٹی سنتے پریشاں گوئی
میر جی کوئی گھڑی تم بھی تو آرام کرو

○

میر سے پوچھا جو میں عاشق ہو تم
ہو کے کچھ چپکے سے شرماتے بہت

جذب و بے خودی کی یہ دولت میر کو ورثے میں بھی ملی تھی۔ ان کے والد کامل فقیر تھے اور عم بزرگوار درویش، دونوں بزرگوں کی صحبت اور تربیت میں میر کی سیرت اور مزاج پر جو نقوش مرتسم ہوئے وہ ہمیشہ باقی رہے۔ یہ واقعہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے کہ میر اپنے منہ بولے چچا کے ساتھ اکثر فقیروں کے ہاں جاتے اور فقیروں سے نیاز حاصل کرتے اور ان کی عادات واطوار کا مشاہدہ کرتے۔ ایک بزرگ احسان اللہ کا طریقہ یہ تھا کہ جب کوئی باہر سے انہیں آواز دیتا تو وہ خود ہی فرماتے" احسان اللہ گھر میں موجود نہیں ہے۔" ظاہر ہے کہ وہ جذب ومستی کے عالم میں رہتے تھے اور یہ

نہیں چاہتے تھے کہ کوئی ان کے استغراق میں دخل انداز ہو۔ میرؔ نے عشق مجازی کی دنیا میں قدم رکھا تو انہیں بھی اس بے خودی کا تجربہ ہوا اور یہ خود فراموشی، ان کی طبیعت کا جزو بن گئی   وہ خیالوں کی دنیا میں کھوئے رہتے اور ان کی فکر پریشان، خیالِ مفلس کی طرح پھوا کرتی رہتی   یہ بے خودی انہیں بہت عزیز تھی اور وہ تصورات کی ان پرچھائیوں سے جدا ہونا نہیں چاہتے تھے۔ اس کیفیت کی ترجمانی ان کے کئی اشعار سے ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر چند اشعار لکھے جاتے ہیں :۔

ملنے والو پھر ملے گا ہے وہ عالم دیگر میں
میرؔ فقیر کو سکر ہے یعنی مستی کا عالم ہے اب

○

مسکن جہاں بمقابل زدہ مسکیں کا ہم تو واں
کل دیر میرؔ میرؔ پکارے کہاں ہے اب

○

گلی میں اس کی گیا، سو گیا، نہ بولا پھر
میں میرؔ میرؔ کر اس کو بہت پکار رہا

○

از خویش رفتہ اس بن رہتا ہے میرؔ اکثر
کرتے ہو بات کس سے وہ آپ میں کہاں ہے

○

میرؔ فقیروں اور صوفیوں کے دامن میں پلے بڑھے تھے لیکن ابھی ان کا شعور پختہ نہ ہوا تھا کہ تصوف کی عملی تعلیم دینے والے اس دنیا سے گذر گئے، اس لئے میرؔ نے قلندرانہ مزاج اور فقر و قناعت کی دولت تو کسی قدر حاصل کی لیکن وہ صوفی نہ بن سکے، اور تصوف ان کے لئے "برائے شعر گفتن" ہی رہا۔ اگر وہ عشق و عرفان کا یہ سبق عملی زندگی سے حاصل کرتے تو وہ صحیح معنوں میں علی متقی کے بیٹے اور امان اللہ کے بھتیجے ہوتے، اور پھر ان کی شاعری خواجہ میر دردؔ سے بہت مختلف نہ ہوتی، اس شاعری میں جذبے کی پاکیزگی اور طہارت تو ہوتی، خون کی گرمی اور جنس کی خوشبو نہ ہوتی، یہ لہک اور مہک میرؔ نے اپنے جسم و جان کے تجربے سے پیدا کی ہے، میرؔ نے تصوف کا علم کتابوں سے حاصل کیا تھا، ممکن ہے کہ خان آرزو کی صحبت میں بھی درس لیا ہو، بہر حال ان کی غزلوں میں ایسے اشعار مل جاتے ہیں جو صوفیانہ عقائد کی ترجمانی کرتے ہیں، لیکن ان میں وہ جذبہ نہیں ہے جو خالص عشقیہ اشعار میں کروٹیں لیتا ہے، البتہ دنیا کی بے ثباتی اور فقر و قناعت سے متعلق جو اشعار ہیں ان میں نسبتاً زیادہ صداقت ہے، جس کا سبب یہی ہو سکتا ہے کہ میرؔ نے یہ احساس کسی صوفی کی تعلیم سے نہیں، زندگی کے مشاہدے سے پیدا کیا تھا۔ میرؔ کے فن کی یہ بڑی نمایاں خصوصیت ہے کہ انہوں نے زندگی کو جیسا دیکھا اور پایا اس کا اظہار فنی خلوص اور طہارت کے ساتھ کیا ہے اس لئے ہم شاعر کی اس خصوصیت کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے

کس کا کعبہ کیسا قبلہ، کون حرم کیا احرام
کوچے کے تیرے باشندوں نے سب کو یہیں سے سلام کیا

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
جو چاہیں سو آپ کرے ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

○

ہم نہ کہتے تھے کہ مت دیر و حرم کی راہ چل
اب یہ جھگڑا حشر تلک شیخ و برہمن میں رہا

○

فقیرانہ آئے صدا کر چلے
میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے

○

آگے کسو کے کیا کریں دست طمع دراز
وہ ہاتھ سو گیا ہے سرہانے دھرے دھرے

○

تھا مستعار حسن سے اس کے جو نور تھا
خورشید میں بھی اسی کا ذرہ ظہور تھا
تھا وہ تو رشک حور بہشتی ہمیں میں میر
سمجھے نہ ہم تو فہم کا اپنی قصور تھا

○

جہاں سے تو رخت اقامت کو باندھ
یہ منزل نہیں بے خبر راہ ہے

موت اک ماندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

○

جاتے ہے جی نجات کے غم میں
ایسی جنّت گئی جہنم میں

○

یہ توہّم کا کارخانہ ہے
یاں وہی ہے جو اعتبار کیا

○

میر اور دردؔ کی شاعری میں وہی فرق ہے جو دونوں کی زندگی اور مزاج میں ہے۔ خواجہ میر دردؔ نے زندگی کو ایک صوفی کی نظر سے دیکھا اور شاعر کی زبان میں اس کا اظہار کیا، شاعری ان کے لئے ذریعۂ عزت نہیں صرف ذریعہ اظہار ہے، وہ پہلے صوفی ہیں اور پھر شاعر ——— میرؔ کو زندگی نے عاشق مزاج، ناکام محبّت، اور فقیر بے نوا بنایا، ان کی شاعری کے آئینے میں جو چہرہ نظر آتا ہے وہ ایک دل شکستہ اور دردمند انسان کا ہے، جو شاعرانہ وضع قطع رکھتا ہے اور اپنی زبان میں کچھ کہنا چاہتا ہے، اس کی زبان صوفی کی نہیں ایک عاشق اور شاعر کی زبان ہے، اپنے محبوب کا رنگ وروپ اور شیوۂ انداز و ادا بیان کرنے میں اسے خاص مزہ آتا ہے، وہ اس کوچے کے پیچ و خم سے واقف ہے، حسن کی دزدیدہ نگاہی اور عشق کی شوریدہ سری اس کا مقدر

۴. میر تو اپنی محبت اور اپنے محبوب کا پرستار ہے اور اسی کے ترانے گاتا ہے

نازکی ان لبوں کی کیا کہیئے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

میر ان نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے

○

دور بہت بھاگو ہو ہم سے سیکھ طریق غزالوں کا
وحشت کرنا شیوہ ہے کچھ اچھی آنکھوں والوں کا

○

اٹھتی نہیں ہیں واں سے تا مجھ تلک بھی پہنچیں
پھرتی ہیں وے نگاہیں پلکوں کے سائے سائے

○

برقع اٹھتے ہی چاند سا نکلا
داغ ہوں اس کی بے حجابی سے

کھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے
اس کی آنکھوں کی نیم خوابی سے

○

ساعدِ سیمیں دونوں اس کے ہاتھ میں لے کر چھوڑ دیئے
بھولے اس کے قول و قسم پر ہائے خیال خام کیا

○

چارہ گری بیماریٔ دل کی رسمِ شہرِ حسن نہیں
ورنہ دلبرِ ناداں بھی اس درد کا چارا جانے ہے

تاہم یہ خیال درست نہیں کہ میرؔ زندگی بھر عشق کا راگ الا پتے رہے انہوں نے دنیا کو حکیمانہ نظر سے نہیں دیکھا یا ان کی شاعری میں فکر و نظر کے عناصر ناپید ہیں، خدا نے میرؔ کو بالغ نظر اور اعلےٰ ذہن کے ساتھ ایک طویل عمر بھی عطا فرمائی تھی، ان کا دور اور ان کے حالات بھی ایسے نہ تھے کہ وہ مظاہر عالم سے بے نیاز رہ ساکن و ثابت زندگی بسر کرتے اور حقائق زندگی پر غور کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہ کرتے ہم جانتے ہیں کہ میرؔ نے کئی زمانے دیکھے تھے اور اس عالم انقلاب پر ان کی گہری نظر تھی

کل پاؤں ایک کاسۂ سر پہ جو آگیا
یکسر وہ استخوان شکستہ سے چور تھا

کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر
میں بھی کبھو کسی کا سرِ پُر غرور تھا

یہ سچ ہے کہ ان کی شاعری میں ایک مایوسی اور بے دلی کی لہر دوڑتی ہوئی ہے، دوسرے لفظوں میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ قنوطیت پسند ہیں قنوطیت اور تیقّن کی

اصطلاح اس صدی میں بہت عام ہو گئی ہے اور ہم ہر شاعر پر کسی نہ کسی قسم کا لیبل چسپاں کر دینے کے عادی ہو گئے ہیں، انسان کی زندگی میں کئی خانے ہوتے ہیں لیکن کسی ایک خانے میں انسان کی پوری زندگی کو محدود کر دینا مناسب نہیں ہے، قنوطیت یا رجائیت کا جذبہ یا نظریہ بھی کوئی ماں کے پیٹ سے لے کر نہیں نکلتا، زندگی کے تجربے اور مشاہدے کے بعد ہی انسان کوئی نظریہ مرتب کرتا ہے پھر بعض شخصیتیں حالات کا شکار ہو جاتی ہیں اور بعض حالات کو شکار کرتے ہیں، میر کی شخصیت ان دونوں طبقے کے لوگوں سے مختلف ہے، حالات ان کے قابو سے باہر تھے اور وہ خود بھی حالات سے مصالحت نہ کر سکے، اس مزاج کے انسان کا نظریہ عام لوگوں سے کسی قدر مختلف ضرور ہو گا، اس کی بات روکھی اور چال ٹیڑھی بھی ہو گی، زندگی کے متعلق وہ کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہو سکتا انقلاب کی نیرنگیاں اور حالات کے تغیرات اس کے سامنے تھے، اس صورت میں وہ رجائیت، خوش دلی اور عیش کوشی کی تلقین کس طرح کرتے

اقبال کے نغموں اور جوش کے نعروں کو سننے کے بعد ہمارے حوصلے بڑھ گئے ہیں لیکن اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ زندگی خوشیوں کا گہوارہ نہیں بلکہ بے ثبات و بے بنیاد ہے، ارسطو سے اقبال تک کوئی بھی اس بنیادی حقیقت کی تردید نہیں کر سکا کہ غم زندگی کی بنیادی حقیقت ہے اور غم سے فرار چاہنے والے دراصل زندگی سے دور بھاگنا چاہتے ہیں۔ میر نے بھی زندگی اور دنیا کو حکیمانہ نظر سے دیکھا ہے اور یہ رائے دی ہے۔

سرسری تم جہان سے گزرے
ورنہ ہر جا جہانِ دیگر تھا

○

چار دیواریِ عناصر میرؔ
خوب جاگہ ہے پر ہے بے بنیاد

○

خاک تھی موجزن جہاں میں اور
ہم کو دھوکا یہ تھا کہ پانی ہے

○

آفاق کی منزل سے گیا کون سلامت
اسباب لٹا راہ میں یاں ہر سفری کا

○

آدمِ خاکی سے عالم کو جِلا ہے ورنہ
آئینہ تھا تو مگر قابل دیدار نہ تھا

○

آدمی سے مَلک کو کیا نسبت
شان ارفع ہے میرؔ انساں کی

○

کہاں ہیں آدمی عالم میں پیدا
خدائی صدقے کی انسان پر سے

ان اشعار سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ میرؔ دنیا کی بے ثباتی کے ساتھ انسان کی عظمت کے بھی قائل تھے، وہ اپنی آشفتہ مزاجی کے سبب شاید کسی قدر آدم بیزار رہے ہوں لیکن عالم بیزار نہ تھے، زندگی میں جیسی انہوں نے تگ ودو کی اور سفر کی صعوبتیں برداشت کیں اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ زندگی میں روشن امکانات سے بالکل مایوس نہیں تھے، اور اپنی سی کوشش ضرور کرتے تھے، یہ ان کی بدنصیبی تھی کہ ان کی کوئی کوشش ان کے لئے مستقل آرام اور سکون کی ضمانت نہ بن سکی، ان کی زندگی میں عارضی طور پر خوشیاں بھی داخل ہوئیں اور جب بھی انہیں آرام کی صورت نظر آئی انہوں نے خوش مزاجی اور زندہ دلی کا ثبوت دیا ـــــ کیونکہ میرؔ نے زندگی کو غموں اور خوشیوں سمیت قبول کیا تھا، خوشی کے لمحوں میں ان کا دل جوان ہو جاتا اور وہ گنگنانے لگتے :-

چلتے ہو تو چمن کو چلئے کہتے ہیں کہ بہاراں ہے
پات ہرے ہیں پھول کھلے ہیں کم کم باد و باراں ہے

○

دور بہت بھاگو ہو ہم سے سیکھ طریق غزالوں کا
وحشت کرنا شیوہ ہے کچھ اچھی آنکھوں والوں کا

○

شوپن ہار نے غم کو زندگی کی مستقل کیفیت تسلیم کیا ہے اور اس کے نزدیک خوشی اور مسرت غموں کے عارضی فقدان کا نام ہے ۔ یہی عارضی فقدان

میرؔ کی زندگی میں بھی ملتا ہے، ورنہ عام طور پر وہ دکھ درد سے سوگوار اور غم دل کے مرثیہ خواں رہے۔ اور آخر کو انہوں نے اس غم کو مقدر سمجھ لیا۔

کرو توکل کہ عاشقی میں نہ یوں کروگے تو کیا کروگے

الم جو یہ ہے تو دردمندو! کہاں تلک تم دوا کروگے

اب تک ہم نے میرؔ کی غزل میں ان کی خارجی اور داخلی زندگی کے عناصر و اثرات کا سراغ لگانے کی کوشش کی ہے یعنی انہوں نے اپنی زندگی اور زمانے میں جو دیکھا سنا اور کھویا اور پایا وہ کس کس طرح غزل میں ظاہر ہوا، دوسرے لفظوں میں یوں کہیں گے کہ میرؔ کی غزل کے مخصوص عناصر کا تجزیہ کیا گیا ہے، اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ بنیادی طور پر ان کی غزل مندرجہ ذیل عناصر پر مشتمل ہے۔

۱ - خارجی ماحول کی عکاسی

۲ - انقلاب کی نیرنگیاں

۳ - ناکامیٔ عشق

۴ - ذکرِ غمِ دل و ذکرِ محبوب

۵ - خود فراموشی و خود کلامی

۶ - فقر و قناعت

۷ - فکر و نظر کا عنصر

۸ - غم جاوداں

لیکن یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ میرؔ کو قدرت نے ایک فنکار پیدا کیا تھا محض خارجی یا داخلی حالات کی عکاسی کسی کو علم و فن کی بارگاہ میں مستقل جگہ نہیں دلا سکتی

عشق کرنے سے بھی ہر شخص شاعر نہیں بن سکتا، غزل کے معنی ہیں محبوب سے باتیں کرنا، لیکن ہر بات کو ہم غزل نہیں کہہ سکتے، کسی بات یا چیز کو فن کے سانچے میں ڈھالنا ضروری ہے، شاعری معنی آفرینی کا نام ضرور ہے، لیکن قافیے سے پیچھا چھڑانا بھی آسان نہیں ہے، مقصد یہ کہ ہر فن کے کچھ تقاضے اور اصول ہوتے ہیں ان کی پابندی کرنی پڑتی ہے، صنائع و بدائع شاعر کے جذبے کی شدت میں کوئی اضافہ نہیں کرتیں اور اکثر بے تکلف اظہار بیان میں رکاوٹ بنتی ہیں لیکن کبھی کبھی یہ آرائش کلام بے حد خوشنما معلوم ہوتی ہے، شاعری جذبے کی ترجمانی بھی ہے اور معجز بیانی بھی، شاعری کے پیغمبری ہونے میں یقیناً شبہ ہے، لیکن اس کی صنعت گری مسلم ہے، آتش نے تو اسے مرصع سازی کا نام دیا ہے لیکن میر جیسے داخلی شاعر نے بھی شاعری کے صنعتی پہلو کو نظرانداز نہیں کیا اور خود کو صناع اور ہنرمند سمجھتے رہے :-

صناع سب ہیں خوار ازاں جملہ ہوں میں بھی
ہے عیب بڑا اس میں جسے کچھ ہنر آوے

○

صناع طرفہ ہیں ہم عالم میں ریختہ کے
گر میر جی لگے گا تو سب ہنر کریں گے

○

اس صنائع کا اس بدائع کا
کچھ تعجب نہیں خدائی ہے

میر صاحب جانتے تھے کہ خیال کی رعنائی اور جذبے کی صداقت

کے ساتھ فنی مہارت لازمی ہے، یہ ضرور ہے کہ انہوں نے کبھی صنعت گری کی خاطر جذبے یا خیال کو قربان نہیں کیا، بلکہ میرؔ کے متعلق تو یہاں تک کہا جا سکتا ہے کہ ان کا ہر جذبہ اپنے اظہار کا انداز بھی ساتھ ہی لے کر نکلتا ہے، میرؔ نے علمی لیاقت اور فنی ریاضت پر بہت زور دیا جس کا مقصد یہی تھا کہ شاعر ان نازک نازک باتوں سے بھی بے خبر نہ رہے، جو بعض اوقات شعر میں جان ڈال دیتی ہیں، میرؔ کے کلام کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں نغمے کی ایک لہر دوڑتی ہوئی محسوس ہوتی ہے یہ موسیقیت بعضوں کے نزدیک شاعری کی بنیادی خاصیت ہے۔ غزل کے صوت و آہنگ کا دار و مدار اس کے وزن، بحر، قافیہ، ردیف اور مترنم الفاظ پر ہوتا ہے، غزل میں مترنم الفاظ کے استعمال کی گنجائش زیادہ ہوتا ہے۔ میرؔ کے یہاں اس نغمگی کا خاص اہتمام نظر آتا ہے، کبھی ردیف اور قافیے سے اور کبھی منتخب بحروں کے انتخاب کی وجہ سے وہ جذباتی زیر و بم کی کیفیت پیدا کرتے ہیں

کرو توکل کہ عاشقی میں نہ یوں کرو گے تو کیا کرو گے
الم جو یہ ہے تو دردمندو کہاں تلک تم دوا کرو گے

جگر میں طاقت کہاں ہے اتنی کہ درد ہجراں سے مرتے رہیے
ہزاروں وعدے وصال کے تھے کوئی بھی جیتے وفا کرو گے

عہد جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند
یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا

ساعد سیمیں دونوں اس کے ہاتھ میں لا کر چھوڑ دیئے
بھولے اس کے قول و قسم پر ہائے خیال خام کیا

نہ گیا خیالِ زلف سیہ جفا شعاراں
نہ ہوا کہ صبح ہووے شبِ تیرہ روزگاراں

رکھے تاج زر کو سر پر چمنِ زمانہ میں گل
نہ شگفتہ ہو تو آتا کہ خزاں ہے یہ بہاراں

○

عمر بھر ہم رہے شرابی سے
دلِ پر خوں کی اک گلابی سے

کھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے
اس کی آنکھوں کی نیم خوابی سے

○

شاعری میں الفاظ کی تکرار عیب بھی ہے اور ہنر بھی ــــــ اور میرؔ نے تو یہ کہا ہے کہ "عیب بھی کرنے کو ہنر چاہیئے" بہر حال ہر کام میں سلیقہ شرط ہے، اور میرؔ کا سلیقہ تو مشہور ہی ہے، انہوں نے تکرار لفظی کا استعمال شاعرانہ سنّت پر عمل کرنے کے لئے نہیں کیا، بلکہ اپنے بیان کو زیادہ مؤثر اور حسن خیز بنانے کے لئے کیا ہے ــــ نغمگی کے ساتھ معنی آفرینی اور مفہوم کی بہتر وضاحت ــــ یہی صنعتِ تکرار کا مقصد ہے جو میرؔ کے ذہن میں تھا ــــ بعض جگہوں پر لفظوں کی تکرار محاورہ اور روزمرہ کی شکل میں آتی ہے جس کی برجستگی میں شبہہ ہی نہیں ہو سکتا، لیکن جہاں جہاں اس کا دانستہ استعمال ہوا ہے وہ بھی لطفِ معنی سے پُر ہے، یہاں چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

پتا پتا بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے ! ! !
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

آگے اس متکبّر کے ہم خدا خدا کیا کرتے ہیں
کب موجود خدا کو وہ مغرور خود آرا جانے ہے

○

صبح وہ آفت اُٹھ بیٹھا تھا تم نے نہ دیکھا صد افسوس
کیا کیا فتنے سر جوڑے پلکوں کے سائے سائے گئے

○

اٹھتی نہیں ہیں واں سے تا مجھ تلک بھی پہنچیں
پھرتی ہیں وے نگاہیں پلکوں کے سائے سائے

○

آگے کسو کے کیا کریں دست طمع دراز
وہ ہاتھ سو گیا ہے سرہانے دھرے دھرے

گلشن میں آگ لگ رہی تھی رنگِ گل سے میرؔ
بلبل پکاری دیکھ کے صاحب پرے پرے

○

عالم عالم عشق و جنوں ہے دنیا دنیا تہمت ہے
دریا دریا روتا ہوں میں صحرا صحرا وحشت ہے

پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ صنائع و بدائع کی حیثیت بنیادی نہیں آرائشی ہے، اس سلسلے میں مولانا حالیؔ نے پتے کی بات کہی ہے، مقدمہ شعر شاعری میں لکھتے ہیں۔
"صنائع و بدائع پر کلام کی بنیاد رکھنے سے اکثر معنی کا سررشتہ ہاتھ سے جاتا رہتا ہے اور کلام میں بالکل اثر باقی نہیں رہتا، کیونکہ مخاطب کے دل میں یہ خیال گزرنا کہ شاعر نے شعر کی ترتیب میں تصنع کیا ہے اور الفاظ میں اپنی کاریگری ظاہر کرنی چاہی ہے، بالکل شعر کی تاثیر کو زائل کر دیتا ہے، پس صنائع کی پابندی اور التزام سے تمام اصناف سخن میں عموماً اور غزل میں خصوصاً بچنا چاہیے" مولانا حالی نے صنعتوں کے صحیح اور برجستہ استعمال سے بحث کرتے ہوئے میرؔ کے دو شعر مثال کے طور پر پیش کئے ہیں

یہ جو چشم پُر آب ہیں دونوں ؛
ایک خانہ خراب ہیں دونوں !

اس میں ایک کا لفظ ایسا بے ساختہ اور بے تکلف واقع ہوا ہے کہ گویا شاعر نے اس کا قصد ہی نہیں کیا، یہاں ایک کے معنی ہیں نہایت بے مثل، لاجواب، چھٹا ہوا جیسے کہتے ہیں وہ ایک بد ذات ہے یا وہ لوگ ایک شورہ پشت ہیں، دونوں کے مقابلے میں ایک کے لفظ نے آکر شعر کو نہایت بلند کر دیا ہے، ورنہ نفس مضمون کے لحاظ سے اس میں کچھ بھی حقیقت نہ تھی، یہاں فی الحقیقت محض مراعاۃ النظیر نے اس شعر میں اعلیٰ درجے کی بلاغت نہیں پیدا کی بلکہ اس بات نے پیدا کی ہے کہ دو چیزوں پر لفظ ایک کا اطلاق ایسی خوبی اور بے تکلفی سے ہوا ہے کہ اس سے بہتر تصور میں نہیں آسکتا، ورنہ ایک شعر یا ایک مصرعے میں ایک اور دو کا جمع کر دینا کہ جس کا نام مراعاۃ النظیر ہے کوئی بڑی بات نہ تھی"۔

ایک سب آگ ایک سب پانی
دیدہ و دل عذاب ہیں دونوں

اس شعر میں بھی آگ اور پانی کا مقابلہ نہایت بے تکلفی سے واقع ہوا ہے پس اگر اس قسم کی مناسبت لفظی اتفاق سے شعر میں پیدا ہو جائے تو یہ شاعری کا زیور ہے۔" اسی طرح میر کی تشبیہیں بھی بڑی نازک اور خیال آفریں ہوتی ہیں اور شعر کے معنی و مقصد میں اضافہ کرتی ہیں۔

ترے فراق میں جیسے خیال مفلس کا
گئی ہے فکر پریشاں کہاں کہاں میری

○

شام سے کچھ بجھا سا رہتا ہے
دل ہوا ہے چراغ مفلس کا!

○

اس کے گئے پہ دل کی خرابی نہ پوچھیے
جیسے کسی کا کوئی نگر ہو لٹا ہوا

○

کچھ موج ہوا پیچاں اے میرؔ نظر آئی
شاید کہ بہار آئی زنجیر نظر آئی

اس قسم کے بہت سے فنی محاسن میرؔ کی غزل میں مل جائیں گے، لیکن جس

چیز نے میر کو خدائے سخن بنایا وہ ان کا اپنا خاص شیوۂ گفتار اور سلیقۂ بیان ہے جس کی بدولت انہوں نے اپنے دردمند دل کی تفسیر پیش کی اور دوسروں کے دلوں پر جذباتی تسلط حاصل کیا ڈیڑھ سو برس سے زائد عرصے سے اس شیوۂ گفتار اور حسن بیان کی دھوم ہے۔

میر کو بات کرنے اور بات کہنے کا جو سلیقہ ہے وہ کچھ تو ان کے مزاج کی بدولت ہے اور کچھ کمال فن کا نتیجہ ہے، چونکہ مزاج کی یہ انفرادیت اور فن سے اس قدر والہانہ وابستگی دوسروں میں نہیں ملتی، اس لئے یہ کوئی حیرت کی بات نہیں کہ میر جیسا سلیقہ شعار شاعر دوسرا نہ پیدا ہو سکا، شاعری کی ایک تعریف یہ بھی کی گئی ہے کہ وہ اظہار کا ایک فن ہے، میر کا فن اس معیار پر پورا اترتا ہے، ان کے نزدیک شعر کہنا باتیں کرنا ہے، شاعری ان کی فطری زبان ہے، وہ اسی زبان میں گفتگو کرتے ہیں، غالب کا دعوےٰ تھا کہ انہوں نے مراسلے کو مکالمہ بنا دیا، لیکن دیکھا جائے تو غالب سے پچاس برس قبل میر نے شعر کو مکالمے کی صورت دیدی تھی اور وہ خود بھی اپنی شاعری کو باتیں ہی کہتے تھے۔

باتیں ہماری یاد رہیں پھر باتیں ایسی نہ سنیئے گا
پڑھتے کسی کو سنیئے گا تو دیر تلک سر دھنیئے گا

پڑھتے پھریں گے گلیوں میں ان ریختوں کو لوگ
مدت رہیں گی یاد یہ باتیں ہماریاں

حسن تو ہے ہی کرو لطف زباں بھی پیدا
میر کو دیکھو کہ سب لوگ بھلا کہتے ہیں

کیا تھا شعر کو پردہ سخن کا
سو اب ٹھہرا یہی ہے فن ہمارا

میرؔ نے کئی جگہ سلیقے کا لفظ استعمال کیا ہے، جس کی اہمیت اور معنویت پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ سلیقے کا اظہار مختلف صورتوں میں ہو سکتا ہے، کسی موقع پر سیدھے سادے انداز میں بات کرنا مستحسن سمجھا جاتا ہے تو کسی جگہ حسن بیان سے کام لینا مناسب ہوتا ہے۔ میرؔ کے اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ سلیقہ شعاری کے تمام قرینوں سے واقف تھے، کہیں سادگی اور بے تکلفی ہے تو کہیں جدت اور انفرادیت، بعض باتیں انہوں نے سو بار کہی ہیں اور سو طرح سے کہیں اور کسی بات کو انہوں نے اس انداز سے کہہ دیا کہ سو طرح کہنے پر بھی کوئی ان کے حسن بیان سے آگے نہ جا سکا۔ مقدمہ شعر و شاعری میں حالیؔ نے چاک گریبان کے مضمون کے تیئیس ۲۳ اشعار کا حوالہ دیا ہے اور بتایا ہے کہ ان میں کوئی بھی شعر میرؔ کے اس شعر کا حریف نہ بن سکا:

اب کے جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے
دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

مولانا حالیؔ لکھتے ہیں "جوشِ جنوں میں گریبان یا دامن یا دونوں کو چاک کرنا ایک نہایت مبتذل اور پامال مضمون ہے جس کو قدیم زمانے سے لوگ برابر باندھتے چلے آئے ہیں، ایسے چچوڑے ہوئے مضمون کو میرؔ نے باوجود غایت درجے کی سادگی کے ایک اچھوتے اور دلکش اسلوب میں بیان کیا ہے کہ اس سے بہتر اسلوب تصور میں نہیں آسکتا"
دوسری جگہ اسی شعر کے بارے میں مولانا حالیؔ نے ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا

ہے، مولانا آزردہ کے مکان پر ان کے چند احباب جن میں مومن اور شیفتہ بھی تھے ایک روز جمع تھے، میر کا یہ شعر پڑھا گیا، شعر کی بے انتہا تعریف ہوئی اور سب کو یہ خیال ہوا کہ اس قافیے کو ہر شخص اپنے اپنے سلیقے اور فکر کے موافق باندھ کر دکھلائے، سب قلم دوات اور کاغذ لے کر الگ الگ بیٹھ گئے اور فکر کرنے لگے، اسی وقت ایک اور دوست وارد ہوئے، مولانا سے پوچھا کہ حضرت کس فکر میں بیٹھے ہیں، مولانا نے کہا کہ قل ہو اللہ کا جواب لکھ رہا ہوں"

میرے خیال میں نیازمندی اور عقیدت کا یہ حسین ترین نذرانہ ہے جو ادب کے پیغمبروں نے خدائے سخن کے حضور میں پیش کیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ میر کی خداوندی غزل میں مسلم ہے، شاعری میں پیغمبری کے دعویدار تو بہت سے پیدا ہوئے اور بعض نے اپنی حیثیت منوا بھی لی۔ بعضوں نے امام المتغزلین اور رئیس المتغزلین کا رتبہ بھی حاصل کیا۔ لیکن غزل کی کائنات میں خدائے سخن میر ہی ہے۔ اور یہ خوشی کی بات ہو یا افسوس کی لیکن میر کا شیوۂ گفتار اور الم آشنا مزاج ہماری شاعری میں اتنا رچ بس گیا ہے کہ یہی غزل کا فطری مزاج قرار پا گیا ہے۔

میر و مرزا

میر کی عظمت اور انفرادیت کو سمجھنے کی خاطر ہم چند اکابر شعراء کے ساتھ ان کی شاعری کا تقابلی مطالعہ کریں تو نامناسب نہ ہوگا، یوں تو کسی شاعر کا دوسرے سے موازنہ کرنے کی رسم چل نکلی ہے۔ میر و سودا، غالب و مومن، انیس و دبیر اور ناسخ و آتش لازم ملزوم بن چکے ہیں اور ایک کے تذکرے کے بغیر دوسرے کا نقشہ

نامکمل سا محسوس ہوتا ہے، اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ان ہر دو شاعروں نے ایک ہی فضا میں سانس لی اور ایک دوسرے کے معاصر و مقابل رہے، بعض صورتوں میں ان کے ذاتی تجربات اور حالات بھی ایک دوسرے سے بہت مختلف نہیں رہے، مثلاً سوداؔ اور میرؔ کو لیجیے۔ دونوں کی شاعری نے دلّی میں آنکھ کھولی اور پروان چڑھی، خان آرزو کے دامن تربیت کا سایہ دونوں پر پڑا، بادشاہ وقت شاہ عالم سے دونوں کا کسی نہ کسی حد تک تعلق رہا، دلّی کے حالات سنگین تر ہو گئے تو وہ یکے بعد دیگرے لکھنؤ پہنچے وہاں شجاع الدولہ اور پھر آصف الدولہ کی سرکار سے متعلق رہے ۔ حالات کی اس قدر یکسانیت کے باوجود دونوں کے مزاج میں کافی فاصلہ ہے، جو ان کی شاعری میں بھی نظر آتا ہے، یہی معاملہ دوسرے شعراء کے ساتھ بھی ہے اور کوئی بڑا شاعر اپنی منفرد شخصیت سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں، غالبؔ کسی قیمت پر مومن نہیں بن سکتا تھا اور مومنؔ کو غالب بننے کی آرزو کبھی نہیں ہوئی، ہر بڑا شاعر اپنا مزاج، اپنا انداز فکر اور ایک مخصوص سلیقۂ اظہار رکھتا ہے اسی لئے ہر شاعر مشابہت کے باوجود دوسرے سے مختلف ہے اور ہر نغمے کا زیر و بم اور تاثیر الگ ہے۔

میرؔ اور مرزا سوداؔ دونوں اپنے عہد کے عظیم شاعر ہیں، بزرگوں نے ہمیں بتایا ہے کہ میرؔ غزل کے بادشاہ ہیں اور سوداؔ قصیدے کے ۔ لیکن جدید تنقید اس جمہوری دور میں اس بادشاہت کے فرمان کو کافی نہیں سمجھتی اور دونوں شاعروں کی شاعرانہ حیثیت متعین کرنے کیلئے ان کے ماحول اور مزاج کا تجزیہ بھی ضروری سمجھتی ہے، سوداؔ نے قصیدے میں اپنی جولانی طبع کے کمالات کا اظہار کیا تاہم وہ غزل کے میدان میں بھی

گمردِ کارواں نہیں، رہبرِ منزل ہیں، اور میرؔ کی طرح سوداؔ کی استادی کا بھی بڑے بڑوں نے اعتراف کیا ہے، ناسخؔ اور آتشؔ کی رائے ملاحظہ ہو :-

کب ہماری فکر سے ہوتا ہے سوداؔ کا جواب
یاں تتبع کرتے ہیں ناسخؔ ہم اُس مغفور کا!

پہروں ہی مصرعۂ سوداؔ ہے رلاتا آتشؔ!
"تجھ سے اے دیدۂ گریاں نہ ہوا تھا سو ہوا"

مرزا غالبؔ نے سوداؔ کے اس شعر کو "تیز نشتر" قرار دیا ہے :-

دکھلائیے لے جا کے تجھے مصر کا بازار
لیکن نہیں خواہاں کوئی واں جنس گراں کا

خود میر تقی میرؔ نے جو مشکل ہی سے کسی کی عظمت کا اعتراف کرتے تھے سوداؔ کو پورا شاعر تسلیم کیا ہے، روایت ہے کہ کسی نے میر صاحب سے دریافت کیا کہ اس دور میں صحیح معنوں میں کتنے شاعر ہیں، انہوں نے فرمایا صرف ڈھائی ہیں دوسرے سوداؔ، پوچھنے والے نے کہا خواجہ میر دردؔ بھی تو ہیں، میر صاحب نے کہا کہ پھر ڈھائی سمجھ لیجئے۔ بعض اشعار میں بھی سوداؔ کا ذکر معنی خیز انداز میں موجود ہے،

نہ ہو کیوں ریختہ بے شورش و کیفیت و معنیٰ!
گیا ہو میرؔ دیوانہ، رہا سوداؔ سو مستانہ

میرؔ و سوداؔ میں حریفانہ کشمکش یا معاصرانہ چشمک ضرور رہی لیکن دونوں

ایک دوسرے کی عظمت سے انکار نہیں کر سکے، میرے خیال میں یہ دونوں کی شرافت اور تنقیدی دیانت کی دلیل ہے، سوداؔ کا ایک مقطع ہے:

سوداؔ تو اس غزل کو غزل در غزل ہی لکھ!
ہونا ہے تجھ کو میرؔ سے استاد کی طرف

میرؔ کی شاعری پر کسی قدر تفصیل سے گفتگو ہو چکی ہے، اب سودا کی غزل پر نظر ڈالی جائے تو دونوں کی خصوصیات اجاگر ہو سکتی ہیں، یہ سچ ہے کہ میرؔ کی زبان غزل کی زبان ہے، دل کا افسانہ کہنے کے لئے جس نرم گفتاری اور دھیمے لہجے کی ضرورت ہے وہی میرؔ کی زبان ہے، یہ بات پہلے بھی کہی جا چکی ہے کہ میرؔ کی قلندرانہ شخصیت غزل پر اس قدر چھا گئی کہ غزل کا مزاج متعین ہو گیا، سوداؔ نے اپنی غزل میں اپنا مزاج اور تیور سمونے کی کوشش کی جو میرؔ سے قدرے الگ ہے تاہم جہاں جہاں غم عشق کی ترجمانی اور دل دردمند کی کہانی ہے، دونوں ایک لہجے میں بات کرتے ہیں، مثلاً سوداؔ کے ان اشعار کے گرد و پیش میر صاحب کو بھی تلاش کیا جا سکتا ہے:۔

جو گزری مجھ پہ مت اس سے کہو جو ہوا سو ہوا
بلاکشانِ محبت پہ جو ہوا سو ہوا!

یہ کون حال ہے، احوال دل پہ اے آنکھو
نہ پھوٹ پھوٹ کے اتنا بہو ہوا سو ہوا

○

اب تلک اشک کا طوفاں نہ ہوا تھا سو ہوا
تجھ سے اے دیدۂ گریاں نہ ہوا تھا سو ہوا

وے صورتیں الٰہی کس ملک بستیاں ہیں
اب دیکھنے کو جن کے آنکھیں ترستیاں ہیں

O

ٹک دیکھ لیں چمن کو چلو لالہ زار تک
کیا جانے پھر جئیں نہ جئیں ہم بہار تک

O

تجھ بن عجب معاش ہے سودا کا ان دنوں
تو بھی ٹک اس کو جا کے ستم گار دیکھنا
خاموش اپنے کلبۂ احزان میں رات دن
تنہا پڑے ہوئے در و دیوار دیکھنا
کہتے تھے ہم نہ دیکھ سکیں روزِ ہجر کو
پر جو خدا دکھاتے تو ناچار دیکھنا

O

جس روز کسی اور پہ بیداد کرو گے
یہ یاد رہے ہم کو بہت یاد کرو گے

O

عشق سے تو نہیں ہوں میں واقف
دل کو شعلہ سا کچھ لپٹتا ہے

O

عشق با پیغمبر وقت اس کو یا رو کیا کہوں

دل تو ایوبی ہوا، آنکھیں ہوئیں یعقوبیاں

سوداؔ کی پر جوش طبیعت کسی میدان میں عاجز نہیں، ایک طرف تو قصیدے میں ان کی دھواں دھار شاعری دوسری طرف غزل میں کبھی نرم کبھی گرم لہجے میں گفتگو، مثنوی اور مرثیہ بھی کہتے رہے اور ایک رنگ کے مضمون کو سو ڈھنگ باندھتے رہے، ہجو نگاری میں تو آج تک حرف آخر مانے جاتے ہیں، جس شاعر کی شخصیت اتنی گمبیر اور پہلو دار ہو اس کی زد سے کون بچ سکتا ہے، انہوں نے میرؔ کی غزل پہ غزل لکھی اور ایسی کہ ہم اسے نظر انداز نہیں کر سکتے، یہ صحیح ہے کہ وہ اپنی قادر الکلامی کے باوجود میرؔ کی انفرادیت پر ضرب نہیں لگا سکے البتہ اپنی صلاحیت کا سکہ جما دیا، میرؔ کی ایک مشہور غزل ہے جس کا مطلع یہ ہے

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا

دیکھا اس بیماریٔ دل نے آخر کام تمام کیا

میرؔ کی اس غزل کی فضا سے اور اس کے مزاج سے ہم کافی مانوس ہو چکے ہیں اور پڑھے لکھے لوگوں کے ذہن میں غالباً پوری غزل محفوظ ہے، اسی زمین اور ردیف و قافیے میں سوداؔ کی غزل بھی موجود ہے اس کے چند اشعار سے اندازہ لگائیے کہ سوداؔ جب کہنے پر آ جائے تو کیا کچھ نہیں کہہ سکتا:

نہ وفا نے شرم و مروت سبھی کچھ اس میں سمجھے گئے

کیا کیا دل دیتے وقت اس کو، ہم نے خیال خام کیا

لذت دی نہ اسیری نے صیاد کی بے پروائی سے
تڑپ تڑپ کر مفت دیا جی ٹکڑے ٹکڑے دام کیا
شمع رخوں سے روشن ہو گھر ایسے اپنے کہاں تھے نصیب
صبح ازل سے قسمت نے خاموش چراغِ شام کیا

○

اس میں شک نہیں کہ سودا میر کے رنگ میں شعر کہنے پر قادر تھے لیکن یہ اشعار ان کے مزاج کے ترجمان نہیں، وہ شگفتہ مزاج اور زندہ دل انسان تھے، ان کی طبیعت میں شوخی اور ظرافت کا مادہ کافی تھا، میر کے مقابلے میں وہ رجائی (OPTIMIST) بھی مشہور ہیں اور جس دھوم دھام سے انہوں نے قصیدے کہے ہیں اس سے ان کی پُرجوش طبیعت کا اندازہ ہوتا ہے۔ غزل کو بھی انہوں نے ایک مردانہ لہجہ عطا کیا ہے، وہ تیور کے ساتھ بلند آواز میں گفتگو کرتے ہیں، ان کے یہاں میر کی دردمندی اور سادگی نہیں ہے، اگر ہم میر اور سودا کے ہم معنی اشعار کا انتخاب کریں تو آسانی سے پتہ چل سکتا ہے کہ دونوں کا لہجہ کس قدر مختلف ہے، مثلاً ان اشعار کو دیکھئے، دونوں شعرا اپنے خالق کے مزاج کی ترجمانی کرتے ہیں۔

گلہ میں جس سے کروں تیری بیوفائی کا
جہاں میں نام نہ لے پھر وہ آشنائی کا (میر)

گلہ لکھوں میں اگر تیری بے وفائی کا
لہو میں غرق سفینہ ہو آشنائی کا (سودا)

ایک محروم چلے میر ہمیں دنیا سے
ورنہ عالم نے زمانے کو دیا کیا کیا کچھ (میر)

سودا جہاں سے آکے کوئی کچھ نہ لے گیا
جاتا ہوں ایک میں دلِ پُر آرزو لئے (سودا)

دونوں شاعروں نے اپنے بہت سے اشعار میں اپنی زندگی پر روشنی ڈالی ہے، غالباً یہ ذاتی بیان دوسری توجیہات کے مقابلے میں زیادہ مستند اور قابلِ قبول ہوگا اس لئے مزاج پرسی کا یہ طریقہ بہتر ہے، میر صاحب فرماتے ہیں :-

میں کون ہوں اے ہم نفساں سوختہ جاں ہوں
اک آگ مرے دل میں ہے جو شعلہ فشاں ہے

دیکھا ہے مجھے جن نے سو دیوانہ ہے میرا
میں باعثِ آشفتگیٔ طبع جہاں ہوں

سودا اپنا تعارف اس طرح کراتے ہیں :-

نے بلبلِ چمن نہ گل نو دمیدہ ہوں
میں موسمِ بہار میں شاخِ بریدہ ہوں

گریاں بشکل شیشہ و خنداں بطرز جام
اس مے کدے کے بیچ عجب آفریدہ ہوں

دونوں کی شاعری میں آہ اور واہ کا فرق بتایا گیا ہے جسے آج تک بنیادی طور طور پر درست مانا جاتا ہے، لیکن یہ تنقید محض ایک اشارہ ہے اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ اس سلسلے میں یہ دو شعر مثال کے طور پر پیش کئے جاتے ہیں:۔

سرہانے میر کے آہستہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

سودا کی جو بالیں پہ ہوا شورِ قیامت
خدامِ ادب بولے ابھی آنکھ لگی ہے

میر نے زندگی کو ایک زاویے سے دیکھا تھا، سودا کی نظر زندگی کے مختلف پہلوؤں پر تھی، انہیں ہنسنا بھی آتا ہے اور رونا بھی ——— دل کا مرثیہ کہنا بھی آتا ہے اور قصیدہ نگاری و ہجوگوئی میں بھی وہ سب سے آگے ہیں، میر کی محبوب صنفِ سخن غزل ہے ان کی بعض مثنویوں میں بھی تغزل کے اشعار نکل آئیں گے، میر نے قصیدے بھی کہے لیکن وہ برائے شعر گفتن ہیں اور میر کے لئے ذریعۂ عزت نہیں ہیں، انہوں نے اپنے دیدہ و دل کے خون سے غزل کی شمع جلائی اور اسی کی روشنی میں میر کی شخصیت ابھرتی ہے، سودا ہر فن مولا تھے۔ غزل میں شاید وہ میر سے پیچھے رہ گئے، لیکن قصیدے میں سب سے آگے نکل گئے بلکہ غزل میں بھی بہتوں سے آگے ہیں، پھر سودا کے یہاں شیوۂ گفتار ہی نہیں، فکر و خیال کی رعنائیاں بھی ہیں، غزل میں لہجے کی مردانگی جو سودا کے یہاں ہے وہ ہمیں غالب کی یاد دلاتی ہے، افسوس کہ غزل کو یہ لہجہ راس نہیں آیا، ورنہ سودا کی

غزل کی اور زیادہ قدر ہوتی، اس کے علاوہ معنویت اور ایمائیت میں حسن بیان اور لطف زبان میں بھی ان کا حریف بننا مشکل ہے، سوداؔ اپنے خاص رنگ میں جب کہتے ہیں تو اس طرح کہتے ہیں :-

نسیمِ گل ہی میں صیاد سے جا کر یارو
ذکرِ مرغانِ گرفتار کروں یا نہ کروں

○

ستم روا ہے اسیروں پہ اس قدر صیاد
چمن چمن کہیں بلبل کی اب نوا بھی ہے
سمجھ کے رکھیو قدم دشتِ خار میں مجنوں
کہ اس نواح میں سوداؔ برہنہ پا بھی ہے

○

کیفیتِ چشم اس کی مجھے یاد ہے سوداؔ
ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

○

تھا کس کے دل کو کشمکشِ عشق کا دماغ
یارب برا ہو دیدۂ خانہ خراب کا

○

غیر کے پاس یہ اپنا ہی گماں ہے کہ نہیں
جلوہ گر ورنہ مرا یار کہاں ہے کہ نہیں

دل ٹکڑے ٹکڑے کو بغل بیچ لئے پھرتا ہوں
کچھ علاج ان کا بھی اے شیشہ گراں ہے کہ نہیں

پاسِ ناموس مجھے عشق کا ہے اے بلبل
ورنہ یاں کونسا اندازِ فغاں ہے کہ نہیں

○

ناصح تو نہیں چاشنئ عشق سے آگاہ
بے عشق بتاں جینے کی لذت بخدا ہیچ

ہم شیخ کی سنتے ہیں مریدوں سے بزرگی
دیکھا جو انہیں جا کے تو عمامہ سوا ہیچ

○

شیخی تھی جام کی سو گئی جامِ جم کے ساتھ
وابستہ ہے طلسمِ جہاں اپنے دم کے ساتھ

○

مبادا ہو کوئی ظالم ترا گریباں گیر
مرے لہو کو تو دامن سے دھو ہوا سو ہوا

○

قدرت اللہ قاسم نے اپنے تذکرے میں میر و مرزا کا مقابلہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "مرزا دریا ئیست بیکراں و میر نہریست عظیم الشان" دریا اور نہر کی یہ مثال خاصی دلچسپ ہے اور معنی خیز بھی میر نے اپنی شخصیت کو

غزل کی آبجو میں اسیر کرلیا اور سودا کی طبیعت دریا کی مانند رواں دواں رہی، کبھی کبھی اس میں سیلاب بھی آیا اور بہتوں کو غرقاب کر گئی ـــــ سودا کے قصیدے میں دریا کی روانی تھی اور ہجو میں سیلاب کی تباہ کاریاں ـــــ ہیں ان کی شخصیت کے پس منظر میں ہی ان کی شاعری کا مطالعہ کرنا چاہیے، سودا کو صرف قصیدے کا بادشاہ کہہ کر پیچھا چھڑانا مشکل ہے، سودا کا نام قصیدے ہی کے دم سے اگر روشن ہوتا تو قصیدے کے ساتھ سودا کا بھی جنازہ نکل جاتا، مگر حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے قصیدہ صرف شعر و ادب کی تاریخوں یا درسی کتابوں میں محدود ہو کر رہ گیا ہے لیکن سودا کی غزل ہر دور میں زندہ و تابندہ رہی بغیر کسی خاص رنگ کے ہر زمانے میں ان کا رنگ جمنا مشکل تھا، ان کی بدقسمتی سے میر جیسا عظیم غزل گو ان کا ہمعصر تھا جو ساری زندگی اپنے خون جگر سے اس فن خاص کی پرورش کرتا رہا ظاہر ہے کہ سودا میر نہیں بن سکتے تھے، تاہم یہ بڑی بات ہے کہ انہوں نے اپنی مخصوص جگہ بنائی اور یہ ان کی عظمت کی دلیل ہے، چنانچہ اس دور میں ہم میر و مرزا کا نام ایک ساتھ لیتے ہیں خود میر نے ایک جگہ لکھا ہے:،

بہ قبولِ خاطرِ لطفِ سخن!
دے ہے کب سب کو خدائے ذوالمنن

ایک دو ہی ہوتے ہیں خوش طرز و طور
اب چنانچہ میر و مرزا کا ہے دور

میر تقی میر نے اپنے تذکرہ نکات الشعراء میں سودا کا تعارف اس طرح کرایا ہے "جوانے است خوش خلق، خوش خصلت، گرم جوش، یار باش، شگفتہ رو"

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ گرم جوشی اور شگفتہ مزاجی سودا کی سیرت کی نمایاں خصوصیات تھیں جو ان کی شاعری میں بھی محسوس ہوتی ہیں، میر بچارے غم دل کے ہاتھوں ہمیشہ تنگ رہے، غم جاناں اور گردش دوراں نے انہیں ہمیشہ "پراگندہ روزی پراگندہ حال" رکھا اور وہ ہنس بول کر زندگی بسر کرنے کا اصول اختیار نہ کر سکے۔

سودا کی زندہ دلی نے انہیں احساس محرومی سے محفوظ رکھا، ان کی شاعری میں جینے کا حوصلہ ہے، ان کی آواز میں مردانگی اور تقویت ہے، لیکن غزل کا فن جذبے کی آنچ کے بغیر پختہ اور اثر آفرین نہیں بنتا، یہی وجہ ہے کہ غزل میں میر صاحب کا نام سرفہرست رہا، سودا کی جولانیٔ طبع "تنگنائے غزل" تک کہاں محدود رہ سکتی ہے، انہوں نے قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، شہر آشوب اور خصوصاً ہجو میں بڑے معرکے سر کئے، غزل کا فن جس وفاداری بشرط استواری کا تقاضا کرتا ہے وہ اسے سودا سے نہ ملی ورنہ شاید یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا کہ میر بڑا غزل گو ہے یا سودا۔

میر و غالب

میر و غالب کی شاعرانہ زندگی کے درمیان پچاس ساٹھ برس کا فاصلہ ہے، غالب کے زمانے تک ملک کی سیاست نصف صدی آگے بڑھ چکی تھی ان کی شاعری جس فضا میں جوان ہوئی وہ بہادر شاہ کی دلی تھی جو مغلیہ جاہ و جلال

کی آخری نشانی تھی اور برطانوی اقتدار کی مرکزی قیام گاہ ــــــ ۱۸۵۷ء کا قیامت خیز ہنگامہ تو کافی بعد میں ہوا۔ اس سے پہلے عام شہری زندگی میں قدرے سکون تھا اور آسائش کی گنجائشیں موجود تھیں، علمی اعتبار سے یہ دور تاریخ ادب کا ایک انتہائی روشن باب ہے، غالب کے معاصرین میں ہر شخص ایک منفرد شخصیت اور ممتاز حیثیت کا مالک تھا، علم و فضل کے اتنے روشن ستارے کسی ایک دور میں مشکل سے نظر آ سکتے ہیں، مولانا فضل حق خیرآبادی، مفتی صدرالدین آزردہ، نواب مصطفیٰ خان شیفتہ، سرسید، مومن خان مومن، ابراہیم ذوق اور بہادر شاہ ظفر کا نام لینے کے بعد بھی اس عہد کے شاعروں اور فاضلوں کی فہرست نامکمل رہتی ہے، دانشوروں کی اس محفل میں غالب کی شخصیت ہمیشہ نمایاں رہی، فضل حق خیرآبادی اور مولانا آزردہ ان کے ہم جلیس تھے، مومن اور ذوق کی حیثیت ان کے حریفوں کی سی رہی، شیفتہ اور ظفر ان سے اصلاح لیتے تھے سرسید نے اپنی آئین اکبری پر مرزا سے تقریظ لکھوائی تھی، اس سے پتہ چلتا ہے کہ مرزا کی شخصیت کتنی ہمہ گیر تھی۔

غالب نے اپنے معاصرین میں سے بعض کی سخن فہمی کا مبالغہ کے ساتھ اعتراف کیا ہے مثلاً وہ شیفتہ اور نبی بخش حقیر کی سخن سنجی کے دل سے قائل تھے، لیکن شاعری میں وہ کسی کو اپنا مقابل اور حریف ماننے کو تیار نہ تھے، فارسی میں تو وہ ظہوری اور اور نظیری کی ہم نوائی کے دعویدار تھے تو اردو میں بھلا کون ان کی نظر میں جچتا، لیکن میر کی اُستادی کے وہ معتقد تھے اور ان کے دیوان کو "گلشن کشمیر" کہتے تھے، اس کے علاوہ وہ ناسخ کے بھی معتقد تھے، آل احمد سرور لکھتے ہیں "اردو شعراء میں وہ میر اور ناسخ سے متاثر ہوئے۔ آخر میں باوجود اس قدر اظہار نفرت کے ذوق کا رنگ

بھی ان کے کلام میں جھلکتا ہے، میر کا اثر غالب پر بہت اچھا پڑا، ان کی سادگی اور پرکاری جو میر کے رنگ میں ہے، اس میں وہ سادگی، گھلاوٹ، سوز و گداز اور صداقت شعری موجود ہے جس کی وجہ سے میر کے نشتر موجود ہیں۔" اس کے باوجود دونوں کی شاعری میں نمایاں فرق موجود ہے اور یہ فرق دراصل دونوں کے ذہن اور نقطۂ نظر کا فرق ہے،

غالب یوں تو علم تصوف کے ماہر بھی تھے بلکہ ولی ہونے کے دعویدار تھے لیکن شاہ کے مصاحب اور وظیفہ خوار بھی تھے، اس لئے ان کی قلندری اور درویشی کی حقیقت شاعرانہ حُسن بیان سے کچھ زیادہ نہیں ہے، کہنے کو تو وہ یہ بھی کہتے تھے کہ مجھے ستائش کی تمنا ہے نہ صلے کی پروا لیکن ہم جانتے ہیں کہ انہیں ستائش کی تمنا بھی اور وہ صلہ بھی پاتے رہے، انہیں کوئن پوئٹ اور ملک الشعرا کا خطاب حاصل کرنے کی خواہش بھی تھی وہ سچے اور پکے مسلمان تھے، لیکن اسلام کے ظاہری شعائر کی پابندی ان کی زندگی میں نظر نہیں آتی ——— وہ حسن طلب میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے، لیکن حُسنِ سلوک اور دوست نوازی کا جوہر ان کے خمیر میں داخل تھا، وہ نہ صرف زندگی، مذہب اور زمانے پر طنز کر سکتے تھے بلکہ خود اپنی ذات کو بھی طنز و تمسخر کا نشانہ بنا لینے میں "تکلف نہیں محسوس کرتے تھے مرزا اکثر از راہ احتیاط بیرنگ خط لکھتے تھے، بعض دکانداروں سے ان کا قرض ادھار بھی چلتا تھا، برہان قاطع پر اعتراض کے ہنگامے کے سلسلے میں انہوں نے جدید صحافت نگاری کے تمام ہتھکنڈوں سے کام لیا، معترضوں کو دندان شکن جواب دئے اور دوسروں سے بھی دلوائے، آخر میں مقدمہ بازی بھی کی، اس کے علاوہ ایک دفعہ قمار بازی کے الزام میں قید بھی ہوتے تھے، وہ شاعری میں اپنی خودداری اور کجکلاہی کا اظہار کرتے ہیں لیکن بہادر شاہ سے ملکہ برطانیہ تک کی شان میں مرزا نے قصیدے لکھے اور

اہتمام سے پیش کئے   سچی بات یہ ہے کہ مرزا غالب ایک دنیادار، معاملہ فہم، دور اندیش اور عیش پسند انسان تھے، میر کی زندگی اور شخصیت میں جس قسم کی یک رنگی ہے غالب کے یہاں اتنی ہی نیرنگیاں ہیں، وہ زندگی کو کسی بلند تر مقام سے دیکھتا ہے اور ہر گوشہ اس کے سامنے ہے، دنیا اس کی نظر میں بازیچۂ اطفال ہے، اس تماشے کو وہ بڑی دلچسپی سے دیکھتا ہے، زمانے کا انقلاب تو دونوں شاعروں نے دیکھا، لیکن دونوں کے نقطۂ نظر میں بڑا فرق ہے، غالب ایک حکیم فرزانہ ہے، اس کا ذہن فلسفی کا اور دل شاعر کا ہے، میر کو زندگی نے شکست دیدی لیکن غالب اس کی گرفت سے باہر ہے زندگی کے متعلق میر کے نظریے کی وضاحت کی جا چکی ہے، اب غالب کا تبصرہ ملاحظہ ہو۔

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

O

غم ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

O

زندگی اپنی اسی ڈھب سے جو گذری غالبؔ
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے
ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ
عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

○

تاب لاتے ہی بنے گی غالبؔ
واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

○

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

○

ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی
ہر چند کہیں کہ ہے پر نہیں ہے

میرؔ کو زندگی سے ناکامی، محرومی اور افسردگی کے سوا کچھ نہ ملا، غم جاوداں ان کا جزو مقدر بن گیا لیکن برداشت غم کا حوصلہ جو غالبؔ کے دل کو ملا تھا وہ میرؔ کے حصے میں کم آیا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بد مزاجی اور بے دماغی کا شکار ہو گئے، غالبؔ کو تو اپنے محبوب کی بھی کم حوصلگی کا شکوہ ہی رہا :

تیرے دل میں گر نہ تھا آشوبِ غم کا حوصلہ
تو نے پھر کیوں کی تھی میری غم گساری ہائے ہائے

غالب کا غم ـــــــ نوابوں اور تعلقداروں کا غم ہے وہ اس دنیئے بے معنیٰ کو غرقِ مے ناب کر دینا چاہتے تھے، انہوں نے اپنی فکری تعبیرت اور حکیمانہ نظر کی بدولت غم زندگی کو فلسفہ کا لباس پہنا دیا، ان کی بھاری بھرکم شخصیت اس غم حیات پر غالب آ جاتی ہے اور وہ جینے کا حوصلہ قائم رکھتے ہیں، یوں تو میر و غالب دونوں آفت رسیدہ تھے لیکن بقول سرور صاحب "میر کا فلسفۂ غم غالب کے فلسفۂ غم سے الگ ہے، میر کے رنج و الم میں اگرچہ ایک مرض کی سی کیفیت ہے مگر اس کی بنیاد صداقت پر ہے، غالب کا رنج و الم ایک قسم کی دماغی عیاشی ہے" ۔ دونوں شاعروں کے ان ہم خیال اشعار پر غور کیجئے ۔

یوں اٹھے آہ اس گلی سے ہم
جیسے کوئی جہاں سے اٹھتا ہے (میر)

موج خوں سر سے گذر ہی کیوں جائے
آستان یار سے اُٹھ جائیں کیا (غالب)

O

گلی میں اس کی گیا، سو گیا، نہ بولا پھر
میں میر میر کر اس کو بہت پکار رہا (میر)

اس فتنہ خو کے در سے اب اٹھتے نہیں اسد
اس میں ہمارے سر پہ قیامت ہی کیوں نہ ہو (غالب)

غالب کو دل کے جانے اور خوشیوں کے لٹ جانے کا اتنا غم نہیں ہے کیونکہ یہ سانحہ تو دل کا مقدر ہے البتہ تمناؤں کی خوشنما عمارت بنانے کی جو حسرت تھی وہ پوری نہ ہو سکی غالب کے یہاں جو غم ہے وہ حسرتِ تعمیر کا ہے، وہ گناہوں کی سزا بھگتنے کو تیار تھے لیکن ناکردہ گناہوں کی حسرت کی داد کے بھی طالب تھے، انہیں دریائے معاصی کی تنک آبی کا بھی شکوہ تھا، وہ چاہتے تھے کہ زندگی سے زیادہ سے زیادہ فیض حاصل کریں اور اور جب یہ تمنا بقدرِ حوصلہ پوری نہیں ہوتی تو انہیں دکھ ہوتا ہے، ایک طرح سے دیکھا جائے تو یہ غم کی منفی شکل ہے، مرزا صاحب کو نشاطِ کار کی ہوس بہت زیادہ تھی اور فرصت عمر کم اس کی شکایت تو انہیں پروردگار سے بھی رہی:

دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا
یاں آ پڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

O

اس جگہ فیض کا ایک مشہور شعر بار بار ذہن میں آ رہا ہے:

اک فرصتِ گناہ ملی وہ بھی چار دن
دیکھے ہیں ہم نے حوصلے پروردگار کے

O

میرؔ کے غم میں شدت اور صداقت ہے لیکن غالب کا غم بھی معنوی نہیں ہے البتہ اس کی فلسفیانہ نظر غم کی تلخی کو گوارا بنا دیتی ہے، وہ غم سے خوفزدہ نہیں ہوتا نہ اس سے فرار چاہتا ہے، غالب اس کا تجزیہ کرتا ہے اور نہ صرف خود بلکہ دوسروں کو اس کی حقیقت سے آشنا کرنا چاہتا ہے، وہ غم جاناں

اور غمِ دوراں دونوں کا مزاج داں ہے، غم اس کے مزاج کا ایک جزو ہے لیکن وہ اپنا دل و دماغ غموں کی تحویل میں دینے پر آمادہ نہیں ہو سکا میر نے زندگی سے صرف غم حاصل کیا جبکہ غالب نے بہت کچھ حاصل کرنا چاہا جس میں غم شامل تھا

گھر میں کیا تھا جو ترا غم اسے غارت کرتا

ہاں مگر ایک جو تھی حسرتِ تعمیر سو ہے

○

غم اگرچہ جانگسل ہے پہ بچیں کہاں کہ دل ہے

غمِ عشق اگر نہ ہوتا، غمِ روزگار ہوتا

○

تیری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں

تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

○

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار

لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

○

میر و غالب کی بحث ایک طرح سے دل اور دماغ کی بحث بھی جا سکتی ہے میر اردو شاعری کا دل ہے اور غالب دماغ ایک دولت احساس کا مالک دوسرا فکری سرمائے کا — غالب نے اردو شاعری کو فکر و نظر کی وسعتیں عطا کیں اور اسے ایک ذہن دیا، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میر کی شاعری میں سوچنے کی کوئی

چیز نہیں ہے یا غالب کی شاعری احساس و جذبے کی نرمی و گرمی سے محروم ہے، تاہم دونوں کا نشان امتیاز یہی ہے کہ ایک احساسات اور جذبات کی دنیا کا مسافر ہے اور دوسرا حکیم فرزانہ ——— زندگی، غم اور عشق ہر چیز کے بارے میں دونوں کا رویہ مختلف ہے، میر کو بچپن ہی سے یہ تعلیم ملی تھی کہ "عشق اختیار کرو، کہ عشق ہی اس کارخانے پر مسلط ہے اگر عشق نہ ہوتا تو تمام نظام درہم برہم ہو جاتا، بے عشق زندگانی وبال ہے اور عشق میں دل کھونا اصل کمال ہے، عشق بسازد و عشق بسوزد، عالم میں جو کچھ ہے وہ عشق ہی کا ظہور ہے"۔ اس کے برعکس غالب یہاں تک کہہ جاتے ہیں کہ کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا" ——— یہ محض شاعرانہ بیان نہیں ہے، غالب واقعی عشق کے معاملے میں ہرجائی تھے، وہ کسی ایک کے ہو کر نہیں رہ سکتے تھے، سچی بات یہ ہے کہ "شیوۂ اہل نظر" سے آشنا ہونے کے باوجود وہ عشق سے زیادہ عیاشی کے قائل تھے۔ مرزا کے ایک دوست حاتم علی مہر کی محبوبہ کا انتقال ہو گیا تو مرزا نے اظہار تعزیت کرتے ہوئے انہیں لکھا:۔

"ابتدائے شباب میں ایک مرشد کامل نے یہ نصیحت کی تھی کہ ہم کو زہد و ورع منظور نہیں، ہم مانع فسق و فجور نہیں، پیو، کھاؤ، مزے اڑاؤ، مگر یہ یاد رہے کہ مصری کی مکھی بنو شہد کی مکھی نہ بنو، سو میرا اس نصیحت پر عمل رہا ہے، کسی کے مرنے کا غم وہ کرے جو آپ نہ مرے، کیسی اشک فشانی، کہاں کی مرثیہ خوانی؟ آزادی کا شکر بجا لاؤ، غم نہ کھاؤ اور اگر ایسے ہی اپنی گرفتاری سے خوش ہو تو چنا جان نہ سہی منا جان سہی ......

زن نو کن اے دوست در ہر بہار
کہ تقویم پارینہ ناید بکار"

پتہ نہیں یہ مرشد کامل کون تھے جنہوں نے مرزا کو ایسی نصیحت کی تھی، میر کے والد بھی کامل فقیر تھے، لیکن ان کی تلقین بالکل مختلف ہے ——— ان دونوں بزرگوں کے نقطۂ نظر میں جو فرق تضاد ہی فرق میر صاحب اور مرزا صاحب کے نظریۂ عشق میں پایا جاتا ہے۔

اس نظریۂ عشق کو ذہن میں رکھتے ہوئے دونوں شاعروں کے یہ شعر پڑھئے تو بات واضح ہو جائے گی:-

اس کے ایفائے عہد تک نہ جیئے
عمر نے ہم سے بے وفائی کی! (میر)

آہ کو چاہیئے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک (غالب)

O

اسی طرح دو شعر اور سنئے اور دونوں سخنوروں کی فکر و نظر کے فاصلے متعین کیجیے:-

اٹھتی نہیں ہیں واں سے تا مجھ تلک بھی پہنچیں
پھرتی ہیں وہ نگاہیں پلکوں کے سائے سائے (میر)

بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی
وہ اک نگہ جو بظاہر نگاہ سے کم ہے (غالب)

میرو غالب دونوں جہان دیدہ شاعر تھے، انہوں نے نہ صرف اپنے گرد و پیش کی دنیا دیکھی بلکہ طویل سفر کے تجربے بھی حاصل کیئے غالب نے لکھنؤ بنارس اور کلکتہ تک کا سفر کیا تھا، میر تقی میر دلی سے گوشۂ عافیت کی تلاش میں لکھنؤ پہنچے، غریب الوطنی کی دشواریوں اور مجبوریوں کا دونوں کو سامنا کرنا پڑا، لیکن یہ سفر انہوں نے اپنی خوشی سے یا محض سیر و سیاحت کے جذبے کے تحت نہیں اختیار کیئے تھے بلکہ گردش حالات انہیں ایک جگہ سے دوسری جگہ لے گئی، میر کے اپنے شہر کی زمین جب ان پر تنگ ہو گئی یا غالب کو پنشن ملنے کے امکانات نظر آئے تو انہوں نے دلی کو خیر باد کہا، ممکن ہے کہ میر کو لکھنؤ میں آسائش کے وہ سامان میسر نہ آئے ہوں جن کی انہیں توقع تھی تاہم ان کی قدردانی ہوئی اور دلی کے مقابلے میں وہ آرام سے رہے، پھر بھی لکھنؤ ان کے مزاج کو راس نہ آیا اور وہ اپنی قسمت کو کوستے رہے، یہ رویہ کسی قدر جذباتی کہلائے گا ارباب وطن کی بے مہری کا تلخ تجربہ رکھنے والے غربت کی شکایت کیونکر کر سکتے ہیں، غالب زندگی کے ہر معاملے کی طرح یہاں بھی حقیقت پسندانہ ردعمل ظاہر کرتا ہے، دیکھیئے دلی سے دور رہ کر دونوں کا ذہن کس نہج پر سوچتا ہے:

دلی کے نہ تھے کوچے اوراق مصور تھے
جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی (میر)

○

خرابہ دلی کا وہ چند بہتر لکھنؤ سے تھا
وہیں میں کاش مر جاتا، سراسیمہ نہ آتا یاں (میر)

○

کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالبؔ
تم کو بے مہریٔ اربابِ وطن یاد نہیں! — غالبؔ

○

مارا دیارِ غیر میں مجھ کو وطن سے دور
رکھ لی مرے خدا نے مری بے کسی کی شرم — (غالبؔ)

○

دراصل دونوں شاعروں کی شخصیت میں نمایاں فرق ہے، میرؔ لاکھ سوچنے سمجھنے پر بھی اپنے دلِ درد مند کو جدا نہیں کر سکتے اور فکر و نظر کی تمام موشگافیاں ان کے جذبے میں غرق ہو جاتی ہیں، غالبؔ دلِ ناداں کی کارگزاریوں کا اعتراف کرتے ہوتے بھی اپنے ذہن سے دست بردار نہیں ہوتے، میرؔ نے اپنے زمانے اور زندگی کی حقیقتوں کو اپنی شخصیت میں جذب کر لیا، غالبؔ کی شخصیت خود عہد آفرین تھی، وہ زمانہ ساز بھی تھے اور زمانہ شناس بھی، میرؔ نے چند قدروں کو ہمیشہ سینے سے لگائے رکھا غالبؔ نے بہت سی قدریں توڑ دیں، اور نئی قدروں کی تعمیر و تشکیل میں حصہ لیا، میرؔ خودداری اور قناعت پسندی کے علم بردار تھے، غالبؔ کی نظر میں ان چیزوں کی اہمیت بہت کم تھی،

غالبؔ ایک عہد آفریں شاعر ہے اس نے آنے والی نسلوں کو بہت متاثر کیا اور اس عالمگیر اثر اندازی میں اقبالؔ کے سوا کوئی بھی اس کا حریف نہیں، لیکن یہ بات بھی خاصی دلچسپ ہے کہ انفرادیت پسندی کے باوجود غالبؔ نے خود بھی بہت سی شخصیتوں کا شعوری یا غیر شعوری اثر قبول کیا ہے، پہلے وہ طرزِ

بیدلؔ میں ریختہ لکھتے رہے اور نازک خیالی پر جان دیتے رہے، ان کی خیال آفرینی یہاں تک بڑھی کہ لوگوں کی سمجھ سے باہر ہوگئی اور مرزا صاحب "گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل" کی کشمکش میں پڑ گئے۔ قلعہ معلّٰی سے تعلق ہوا اور وہاں استاد ذوقؔ کی ٹکسالی زبان کی داد دیکھی تو سادگی پر مائل ہوتے اور اردو شاعری کو چند لازوال غزلیں دیں، شیفتہ اور مولوی فضل حق خیرآبادی کے مشورے پر اپنے کلام کا انتخاب کیا، مکاتیب میں بھی کہیں سادگی اور بے تکلفی کا کہیں حسن بیان اور آرائش زبان کا اظہار کیا، زبان و بیان کا انداز اختیار کرتے وقت وہ مخاطب کے ذوق اور مرتبے کا بھی خیال رکھتے تھے، میرؔ کا معاملہ اس سے مختلف ہے، ان کے کلام کی تاثیر بھی ہمہ گیر ہے اور بہت سے شاعروں پر میرؔ کا سایہ پڑا ہے، لیکن وہ خود کسی کے سائے میں نہیں رہے (ہوگا کسی دیوار کے سائے میں پڑا میرؔ) بچپن میں باپ اور چچا کی تعلیم و صحبت کا ان پر ضرور اثر پڑا لیکن سن شعور پر پہنچنے کے بعد کوئی شخصیت ان پر اثر انداز نہ ہو سکی، خان آرزو سے شجاع الدولہ تک کوئی میرؔ کا شریک غالب نہ بن سکا، سوداؔ کے کلام پر میرؔ کے اثرات کی نشان دہی کی جا سکتی ہے، شاید دردؔ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں، لیکن میرؔ کی شاعری میں دوسرے شعرا کا رنگ نہیں جھلکتا ہے، غالبؔ کے برعکس وہ اپنی ہی کسوٹی پر سب کو پرکھتے رہے، وہ اثر پذیری زیادہ اثر اندازی کے قائل تھے۔

زندگی میں انہوں نے بادل ہی بادل دیکھے تھے توس۔ قزح نہیں دیکھی یہ ابر آلود موسم ان کے مزاج کو راس آگیا تھا اور وہ اسی میں کھوئے رہتے تھے ع

اب کے بھی دن بہار کے یوں ہی گزر گئے

میر صاحب زندگی میں ایک دروازے سے داخل ہوئے اور دوسرے

سے نکل گئے، اس کے برعکس نجم الدولہ نواب اسد اللہ خان غالب عرف مرزا نوشہ کو زندگی میں داخل ہونے کے کئی راستے معلوم تھے شاید چور دروازہ بھی ان کے دائرہ علم سے باہر نہیں تھا، زندگی میں اس ہمہ صفت انسان کی کتنی حیثیتیں تھیں، مسائل تصوف کے تو ماہر ہی تھے، لیکن تیموری خاندان کی تاریخ بھی لکھ سکتے تھے، تجمل خاں سے لےکر ملکہ برطانیہ تک ان کی قصیدہ نگاری کی زد میں آ سکتے تھے، غدر میں اور اس کے بعد کی انتقامی کارروائی میں بڑے بڑوں کا پتہ نہ چلا، لیکن مرزا صاحب کو اللہ نے محفوظ رکھا، ان کے ولی نعمت بہادر شاہ پر جو قیامت ٹوٹی اسے کون نہیں جانتا، ان کے شفیق دوست مولوی فضل حق خیرآبادی کو کالے پانی بھیجا گیا، مولانا آزردہ اور شیفتہ کی جائدادیں ضبط ہوئیں، لیکن غالب سے ایک موقع پر باز پرس ہوئی تو انہوں نے کہا میں تو آدھا مسلمان ہوں، شراب پیتا ہوں سور نہیں کھاتا" چلئے جان بچی، لعنت بھیجئے غدر پر بھی اور انگریزوں پر بھی ـــ غالبِ نکتہ داں سے کیا نسبت! یہ کردار جو حد درجہ دلچسپ اور دلکش بھی ہے، زمانہ سازی سے خالی نہیں ہے۔ غالب تو جانتے تھے کہ "واقعہ سخت ہے اور جان عزیز" وہ لچکنے کے قائل تھے، ٹوٹ جانا انہیں پسند نہ تھا، میر صاحب ٹوٹ سکتے تھے لچکنا ان کی سرشت کے خلاف تھا ـ اس طرح دونوں کے درمیان ذہنی طور پر طویل فاصلے ہیں اور صرف غم دل کے مرکز پر ان کی ملاقات ہو سکتی ہے۔

یہ باتیں دونوں کے مزاج اور نظریے کے بارے میں تھیں جہاں تک فن کا تعلق دونوں بڑی حد تک ہم خیال تھے، فنی کمال کے لئے وہ سوز دل اور دل گداختہ کو ضروری سمجھتے تھے اور فن سے گہری وابستگی کے قائل تھے، غالب نے میر کی آشفتہ سری کی بھی داد دی ہے اور دوسروں کی طرح وہ بھی میر صاحب کے معتقد اور مداح ہیں ـــ

معنی آفرینی اور اسلوب بیان پر دونوں جان دیتے تھے، میرؔ کو اپنے مستند ہونے کا یقین تھا تو غالبؔ کو بھی اپنے انداز بیان کی رعنائی میں کوئی شبہہ نہیں تھا۔

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے!
کہتے ہیں کہ غالبؔ کا انداز بیاں اور

ایک موقع پر غالبؔ نے لکھا تھا "میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں اور خدا کے سوا اور کوئی نہیں جان سکتا کہ ان باون برسوں میں اس نے کس قدر معنی کے دروازے مجھ پر کھولے ہیں اور میری فکر کو کس درجے بلندی بخشی ہے، افسوس کہ لوگوں نے میرے کلام کی خوبی کو نہ سمجھا۔" اسی طرح میرؔ کو بھی متاع ہنر کی ناقدری کا شکوہ رہا فکر و فن کے آئینے میں غالبؔ کی آدم شخصیت حد درجہ دلکش ہے، لیکن میرؔ کا افسردہ چہرہ بھی دلنوازی سے عاری نہیں، غالبؔ کے فکر و خیال کی کائنات بہت وسیع ہے وہ زمین سے آسمان تک پرواز کرتا ہے، میرؔ جس طرف نظر اٹھاتے ہیں انہیں اپنا ہی دل نظر آتا ہے، غالبؔ نے زندگی کے آخری دور میں اسی سادگی اور پرکاری کو اپنایا جو میرؔ کا اصل جوہر ہے، اس عہد کی غزلوں میں وہ میرؔ کے بہت قریب پہنچ گئے ہیں، میرؔ کی سادہ و دل نشین غزلوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے غالبؔ کی ان غزلوں کو پڑھا جائے تو ایک قسم کی یکسانیت اور ذہنی ہم آہنگی کا پتہ چلتا ہے:۔

دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے

ہم کو ان سے وفا کی ہے امید
جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں
کاش پوچھو مدعا کیا ہے!

○

ابن مریم ہوا کرے کوئی
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

کون ہے جو نہیں ہے حاجت مند
کس کی حاجت روا کرے کوئی

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

○

درد منت کش دوا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا بُرا نہ ہوا

جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو
اک تماشا ہوا گِلا نہ ہوا

○

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

ہاں وہ نہیں خدا پرست، جاؤ وہ بے وفا سہی
جس کو ہو دین و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں

اس قسم کی غزلیں وہ ہیں جن کی بدولت غالبؔ کو عام مقبولیت حاصل ہوئی، ان میں غالبؔ کا انداز بیان ضرور ہے لیکن ان کا مخصوص مزاج اور منفرد ذہن نہیں ہے، دوسرے لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان میں ان کی شخصیت کا اتنا اظہار نہیں ہوا ہے جتنا فن اور اسلوب بیان کا، غالبؔ جب تک ایک خاص تیور اور گنجینۂ معنی کے طلسم کے ساتھ شعر نہ کہیں غالبؔ نہیں رہتا، تخیل کی جدت، بیان کی جدت اور فکر کی بلندی غالبؔ کی بنیادی خصوصیات ہیں، اس لئے غالبؔ کی منفرد حیثیت کا اظہار اس قسم کے شعروں میں ہوتا ہے:

آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد
مجھ سے مرے گنہہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

○

بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

○

دل سے تری نگاہ جگر میں اتر گئی
دونوں کو اک نظر میں رضامند کر گئی

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں
اٹھئے بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی

○

مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دور جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

○

محبت میں نہیں ہے فرق مرنے اور جینے کا
اسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے

○

کہاں میخانے کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

○

فلک سے ہم کو عیش رفتہ کا کیا کیا تقاضا ہے
متاع بردہ کو سمجھے ہوئے ہیں قرض رہزن پر

○

جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار
اے کاش جانتا نہ تری رہگذر کو میں

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

○

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تلک نہ تھی پسند
گستاخی فرشتہ ہماری جناب میں

ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ میرؔ جس طرف نگاہ اٹھاتے ہیں انہیں اپنا ہی دل نظر آتا ہے ایک ایسا دل جس نے بیرونی ماحول اور آب و ہوا کے اثرات بھی اپنے اندر جذب کر لئے ہیں، پھر انہیں دل کی کہانی کہنے کا خاص سلیقہ ہے، غالبؔ کی دنیا بہت وسیع ہے، وہ جہاں جاتے ہیں اپنا دل و دماغ ساتھ لے جاتے ہیں اور دماغ ان کا شریک غالب رہتا ہے اس لئے وہ کبھی گہری جذباتیت کے اثر میں نہیں آتے، وہ فکر و جذبے میں ایک فنکارانہ توازن برقرار رکھتے ہیں میرؔ و غالبؔ کے درمیان یہی فلسفیانہ ذہن حد فاصل قائم کرتا ہے، اس طرح میرؔ کی شاعرانہ عظمت کم نہیں ہوتی اور غالبؔ کی انفرادیت باقی رہتی ہے۔

میرؔ و فانیؔ

جذباتی یکسانیت اور ذہنی ہم آہنگی کے ساتھ کوئی میرؔ کا ہم سفر بن سکتا ہے تو وہ فانیؔ ہیں، وہ اپنے جذبے اور سلیقے کے سہارے میرؔ کی آواز میں آواز ملا کر چل سکتے ہیں، لیکن میرؔ کا ساتھ دینا آسان نہیں وہ اپنے پورے زمانے کو ساتھ لیکر چلتے ہیں یہی سبب ہے کہ فانیؔ ایک خاص مقام کے بعد ان کا ساتھ چھوڑ دیتے

ہیں، چنانچہ فانی کا یہ شعر ان سے زیادہ میر صاحب پر زیادہ صادق آتا ہے:

منزل عشق پہ تنہا پہنچے کوئی تمنا ساتھ نہ تھا
تھک تھک کے اس راہ میں آخر اک اک ساتھی چھوٹ گیا

فانی کی شاعرانہ کم نصیبی کا ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ بیسویں صدی میں پیدا ہوئے جب اقبال کے نغمے اور جوش کے نعرے فضا میں گونج رہے تھے اس نقار خانے میں ان کی "مردہ و افسردہ" آواز کسی قدر دب کر رہ گئی اور وہ خود ہی دل مرحوم کی تعزیت کرتے رہے۔ اقبال اور جوش کی نظموں میں جو ذہن کام کر رہا تھا وہ بیسویں صدی کے تقاضوں کے مطابق تھا۔ اردو شاعری، دل کے نہاں خانوں سے نکل کر شہروں، میدانوں، کھیتوں اور کارخانوں میں داخل ہو چکی تھی، غزل کے لئے اپنا مزاج اور پیراہن تبدیل کئے بغیر زندہ رہنا مشکل ہو گیا، شاعروں نے مقابلے کے امتحان پاس کرنے شروع کر دیے، دفتروں اور کارخانوں میں بھرتی ہونے لگے، عشق و محبت کے آداب بھی کسی قدر بدلنے لگے، غم روزگار کی شدت نے غم جاناں کو فراموش کر دینے پر مجبور کر دیا، مزدور، کسان، مفلس کی عید الحسن اور مزدوری جیسے عنوانات پر نظمیں لکھی جانے لگیں، زندگی کی قدریں کچھ مٹ گئیں، کچھ بدل گئیں، اس ہنگامہ آرائی میں فانی کی شاعری بے وقت کی راگنی سمجھی گئی اور انہیں قنوطیت پسند کہا جانے لگا، جوش نے انہیں "بیوۂ عالم" اور "سوز خوان" کا خطاب دیا، اقبال نے جن کا ہاتھ زمانے کی نبض پر تھا، قدامت پسند شاعروں سے بیزاری کا اظہار کیا:

شاعر کی نوا مردہ و افسردہ و بے ذوق
افکار میں سرمست نہ خوابیدہ نہ بیدار

میر و فانی میں یہی فرق ہے کہ میر اپنے عہد کی اجتماعی زندگی سے الگ نہیں ہیں فانی صرف اپنی زندگی اور اپنے دل کی ترجمانی کرتے ہیں، ان کی شاعری میں ہم بیسویں صدی کی زندگی کی جھلک نہیں دیکھ پاتے، ان کا غم ذاتی اور ان کا رویہ انفرادی ہے شاعری کے متعلق ان کا مخصوص نظریہ ہے اور وہ یہ کہ شعر کی "پہلی اور آخری شرط شعریت ہے، شعریت ان کے نزدیک نازک اور لطیف کیفیات پر مشتمل ہے یہ دل سے نکل کر دلوں سے ٹکرا جاتی ہے، وہ اس کے قائل ہیں کہ حقیقی شاعری کوئی افادی پہلو نہیں رکھتی اسے کسی غیر شاعرانہ مقصد کے حصول کے لئے آلۂ کار نہیں بنایا جا سکتا، خواہ وہ مقصد کچھ ہی کیوں نہ ہو، مقصد کی بلندی یا اہمیت سے اس اصول میں کوئی فرق نہیں آسکتا،" شاعر نے اپنا ایک نقطۂ نظر متعین کر لیا ہے اس لئے ضروری ہے کہ ہم اسی کی روشنی میں شاعری کا مطالعہ کریں، شاعری کے متعلق دوسرے نظریات کی بحث چھیڑنا فضول ہے کیونکہ اس صورت میں فانی کی قدر و قیمت متعین کرنے میں بڑی دشواری ہوگی۔

فانی کو زندگی میں مایوسیوں اور محرومیوں سے واسطہ رہا، اس میں عشق کی ناکامی بھی یقیناً شامل ہوگی، وہ خود کو پرستارِ شبِ ہجر اور دشمنِ غم کہا کرتے تھے، آشفتہ طبع میر کا بھی کچھ یہی حال تھا، زندگی اور محبت نے انہیں بھی ناکامی اور نامرادی کے سوا کچھ نہ دیا تاہم وہ زندگی سے بیزار نہیں ہوتے، صرف دل کی ناکام آرزوؤں پر آنسو بہاتے رہے اور درد کا افسانہ سناتے رہے، میر کے یہاں دردمندی اور فانی کے یہاں غم پسندی ہے فانی کا کلام پڑھتے وقت بعض اوقات کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہم کسی میت میں شریک ہیں اور خود انہی کا مصرعہ ذہن میں ابھرتا رہتا ہے "اک جنازہ جا رہا ہے دوش پر"

میرؔ کے یہاں دلِ بیمار کی عیادت ہے اور فانیؔ کے یہاں مرگِ حیات
کا ماتم:

ہر نفس عمرِ گذشتہ کی ہے میت فانیؔ
زندگی نام ہے مر مر کے جئے جانے کا

فانیؔ ہم تو جیتے جی وہ میت ہیں بے گور و کفن
غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا
(فانیؔ)

○

مصائب اور تھے پر دل کا جانا
عجب اک سانحہ سا ہو گیا

کرو توکل کہ عاشقی میں نہ یوں کرو گے تو کیا کرو گے
الم جو یہ ہے تو دردمندو! کہاں تلک تم دوا کرو گے
(میرؔ)

غم زندگی کی بنیادی حقیقت ہے اور اس سے فرار ممکن نہیں لیکن فانیؔ کے نزدیک زندگی مجسم غم ہے اور اس میں خوشی کا تصور بے معنی ہے، دنیا میں جو ہمیں مسرتیں نظر آتی ہیں دراصل غموں کی بدلی ہوئی شکلیں ہیں اور یہ خوشی عارضی چاندنی ہے،، اس کے بعد طویل اندھیری راتیں ہیں، زندگی موت کے انتظار کا نام ہے، موت سے پہلے انسان زیست کی کشمکش سے نجات نہیں پا سکتا اس لئے موت کی تمنا دراصل پرسکون زندگی کی خواہش ہے ـــــ راحتِ دنیا اور موت کے متعلق فانیؔ کے یہ دو شعر ان کے نظریے اور رد یے کی اچھی وضاحت کرتے ہیں:-

ممکن نہیں ہے راحتِ دنیا کی آرزو
غم پر گمانِ راحتِ دنیا کئے بغیر

O

تو کہاں تھی اے اجل اے نامرادوں کی مراد
مرنے والے راہ تیری عمر بھر دیکھا کئے

زندگی کے متعلق یہ نظریہ نامکمل اور یک طرفہ ضرور ہے لیکن غلط نہیں ہے ہم فانی کے ہم خیال نہیں بن سکتے تاہم ان کے خیال کو رد کر دینا ہمارے بس کی بات نہیں اور جب یہ خیال فن کے پردے پر ابھرتا ہے تو اس کی دل نوازی کا کون منکر ہو سکتا ہے فانی کا موضوعِ سخن بحث طلب ہو سکتا ہے لیکن ان کا حسن کلام منفرد اور دلکش ہے، شاعری میں فانی نے غالب کا گہرا اثر قبول کیا ہے، غالب کا فلسفۂ غم اور اندازِ فکر جگہ جگہ ان کے کلام میں جھلکتا ہے لیکن وہ غالب کی ذہانت اور ہمہ گیر شخصیت سے محروم تھے، اس لئے غالب کا جامہ پہننے سے ان کا اندازِ تدچھپ نہیں سکتا، وہ غالب کی ذہنی پرواز کا پورا ساتھ نہ دے سکے، البتہ میر صاحب کا مزاج انہیں کافی راس آیا اور بقدر حوصلہ ان کی ہمنوائی کا حق ادا کر دیا، دونوں کے فکر و احساس میں مماثلت بھی ہے اور دونوں کو بات کرنے کا سلیقہ بھی اندازِ فکر اور سلیقۂ اظہار کا اندازہ ان اشعار سے کیجئے:۔

عہد جوانی ختم ہوا اب مرتے ہیں نہ جیتے ہیں (فانی)
ہم بھی جیتے تھے جب تک مر جانے کا زمانہ تھا

عہدِ جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند
(میرؔ) یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا

دل اجڑنا سہل سہی بسنا سہل نہیں ظالم (فانیؔ)
بستی بسنا کھیل نہیں ہے بستے بستے بستی ہے

○

دل وہ نگر نہیں کہ پھر آباد ہو سکے
(میرؔ) پچھتاؤ گے سنو ہو یہ بستی اجاڑ کے

پھر خواب میں طوق آیا زنجیر نظر آئی (فانیؔ)
درپردہ ہے وحشت کی پھر سلسلہ جنبانی

○

کچھ موج ہوا پیچاں اے میرؔ نظر آئی
(میرؔ) شاید کہ بہار آئی زنجیر نظر آئی

فصلِ گل خیر تو ہے دشت میں دیوانوں کی (فانیؔ)
دامنوں کی خبر آئی نہ گریبانوں کی

اب کے جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے
دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں (میرؔ)

جسم آزادی میں پھونکی تو نے مجبوری کی روح
خیر جو چاہا کیا اب یہ بتا ہم کیا کریں (فانیؔ)

○

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
جو چاہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا (میرؔ)

چمکا دیا ہے رنگ چمن لالہ زار نے
شاید خزاں کو آگ لگا دی بہار نے (فانیؔ)

○

گلشن میں آگ لگ رہی تھی رنگِ گل سے میرؔ
بلبل پکاری دیکھ کے صاحب پرے پرے (میرؔ)

وہ یہیں ہیں جو وہ کہیں بھی نہیں
آیئے دل میں جستجو تو کریں (فانیؔ)

تھا وہ رشک حور بہشتی ہمیں میں میرؔ
سمجھے نہ ہم تو فہم کا اپنی قصور تھا (میرؔ)

موت ہے ایک وقفۂ موہوم
زندگانی سے زندگانی تک (فانیؔ)

موت اک ماندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر (میرؔ)

○

فانیؔ نے جیسا کہ ان کے اشعار سے اندازہ ہوتا ہے میرؔ کے انداز فکر کا گہرا اثر قبول کیا ہے لیکن میرؔ کا لہجہ ان کی قدرت سے باہر رہا۔ اسی طرح ان پر غالبؔ کا بھی سایہ پڑا ہے، اور بعض اوقات وہ غالبؔ کی آواز میں اپنی آواز ملا دیتے ہیں، مثلاً ان اشعار کے پسِ پردہ غالبؔ موجود ہیں:

آگئی ہے ترے بیمار کے منہ پر رونق
جان کیا جسم سے نکلی کوئی ارماں نکلا

چارہ گر، ناصحِ مشفق، دلِ بے صبر و قرار
جو ملا عشق میں غم خوار وہ ناداں نکلا

وائے نادانی یہ حسرت تھی کہ ہوتا در کھلا
ہم قفس راز اسیری کیا کہیں کیوں کر کھلا

اُف اس آزادیِ بے ہنگام کی مجبوریاں
میں قفس کے پاس ہی بیٹھا ہی رہتا در کھلا

پھر چھیڑ دیا وسعتِ محشر کی فضا نے
سودا ترے وحشی کا ابھی کم نہ ہوا تھا

اک کفر سراپا نے کیا حشر کا قائل
میں معتقدِ حشر مجسم نہ ہوا تھا

پھر ناوکِ نگاہ کا دل پھیر سوئے دل
سامانِ صد جراحت پنہاں کئے ہوئے

طوفانِ اضطرابِ جنوں اٹھ کہ دیر سے
بیٹھا ہوں جمعِ خاطرِ داماں کئے ہوئے

ہر نقشِ پا کو دیکھ کے دھنتا ہوں سر کو میں
پہچانتا نہیں ہوں تری رہگزر کو میں

بہلا نہ دل نہ تیرگیٔ شامِ غم گئی
یہ جانتا تو آگ لگاتا نہ گھر کو میں

فانیؔ کے کلیات میں ایسے اشعار کی کمی نہیں ہے جس پر غالبؔ کی مہر لگی ہوئی ہے، میرؔ کے اثرات تو ان کی شاعری میں جائز طور پر سرایت کرنے چاہییں کیونکہ دونوں ایک ہی دنیا کے باشندے ہیں، لیکن یہ کہنا بڑی زیادتی ہوگی کہ فانیؔ صرف میرؔ و غالبؔ کے خوشہ چیں رہے اور انہوں نے خود کوئی راہ نہیں

نکالی   تقلید و تاثر کے باوجود انہوں نے اپنا شیوۂ گفتار معین کیا، ان کے لہجے میں غالب کا سا تیکھا پن ہے نہ میر کی سی گھلاوٹ   بلکہ یہ ایک متوازن اور ٹھہری ہوئی آواز ہے، انہوں نے اردو غزل کو کچھ ایسے اشعار دیئے جو خیال و بیان میں اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں مثلاً

میں نے فانی ڈوبتے دیکھی ہے نبض کائنات
جب مزاجِ یار کچھ برہم نظر آیا مجھے

تم جوانی کی کشاکش میں کہاں بھول گئے
وہ جو معصوم شرارت تھی حیا سے پہلے

دو گھڑی کے لئے میزانِ عدالت ٹھہرے
کچھ مجھے حشر میں کہنا ہے خدا سے پہلے

کوئی خلش سی سینے میں لئے جاتا ہے
ہم تری یاد سے غافل نہیں ہونے پاتے

دشمن جاں تھے تو جانِ مدعا کیوں ہو گئے
تم کسی کی زندگی کا آسرا کیوں ہو گئے

وہ بے وفا ہیں کہ ہم بے وفا خدا جانے
حیات ختم ہے اور ان کی آمد آمد ہے

○

دو چار ہچکیوں میں دمِ نزع کہہ گیا
شرحِ درازیٔ زندگیٔ مختصر کو میں

○

ذکر جب چھڑ گیا قیامت کا
بات پہنچی تری جوانی تک

○

قلب و جگر کے درد کا پھر کس کو ہوش تھا
جب اس نے مسکرا کے یہ پوچھا کہاں کہاں

○

اک عمر پرستارِ شبِ ہجر رہا تھا
اے زلفِ سیہ ماتمِ فانیؔ میں بکھر جا

○

شعری روایات کے پس منظر میں دیکھا جائے تو ہمیں فانیؔ کو لکھنؤ کے دبستان شاعری سے منسلک کرنا پڑے گا اور اس طرح وہ میرؔ سے الگ ہو جاتے ہیں، کہا جاتا ہے کہ لکھنوی شعرا نے عشق سے زیادہ عیاشی کی داستان سنائی، محبوب کی محبت سے زیادہ اس کے جسم اور لباس کو توجہ کا مرکز بنایا اور ان کے لب و لہجے میں بیگماتی انداز پایا جاتا ہے، شاید یہ

معاشرتی زندگی میں عورتوں کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ کا اثر ہو، فانی لکھنؤ کے شاعرانہ مزاج سے صرف اس حد تک وابستہ ہیں کہ ان کی شاعری میں میت، جنازہ، فاتحہ، قاتل، شمشیر اور گور و کفن جیسے الفاظ اکثر نظر آتے ہیں، ان کا محبوب کسی لکھنوی دوشیزہ کی صفات رکھتا ہے، البتہ فانی کے کلام میں اسے تلاش کرنا پڑتا ہے، میر کا معاملہ ذرا مختلف ہے انہوں نے عطار کے لونڈے اور دلی کے کج کلاہ اور چست پوشاک لڑکوں کا بھی ذکر کیا ہے لیکن ان کا دل لوٹنے والی تو شاید اکبر آباد میں رہتی تھی ـــــ میر نے زندگی کا ایک طویل عرصہ لکھنؤ میں گزارا تھا تاہم ان کی شاعری گور و کفن سے تقریباً خالی ہے، فانی کے شاعرانہ ذہن پر لکھنوی روایات اور اندازِ گفتگو کا اثر ان اشعار میں صاف ظاہر ہے:

آزاد کچھ ہوتے ہیں اسیرانِ زندگی
یعنی جمالِ یار کا صدقہ اتر گیا

ہوش جب تک ہے گلا گھونٹ کے مر جائیگا
دمِ شمشیر کا احساں ترے بسمل سے اٹھا

جاتے ہوتے کھاتے مری جان کی قسمیں
اب جان سے بیزار ہوا بھی نہیں جاتا

نگاہِ شوق کی رعنائیوں کا کیا کہنا
مگر خدا کی قسم آپ کا جواب نہیں

وہ مرے قتل کا فرمان سہی
کچھ وہ ارشاد تو فرماتے ہیں

○

اُدھر منہ پھیر کر کیا ذبح کرتے ہو اِدھر دیکھو
مری گردن پہ خنجر کی روانی دیکھتے جاؤ
سنے جاتے نہ تھے تم سے مرے دن رات کے شکوے
کفن سرکاؤ مری بے زبانی دیکھتے جاؤ
وہ اٹھا شورِ ماتم آخری دیدار میت پر
وہ اٹھا چاہتی ہے نعش فانی دیکھتے جاؤ

○

مٹ کر بھی داغ شاہد خونِ شہید ہے
دھویا ہوا ہے دامنِ قاتل جگہ جگہ
اب یادگارِ فانیِ بسمل ہے اس قدر
گلگوں ہے خاکِ کوچۂ قاتل جگہ جگہ

○

اٹھا ہاتھ اے تصورِ فاتحہ کو
یہ دل کی ہے وہ تربت ہے جگر کی

لازم ہے احتیاط ندامت نہیں ضرور
لے اس چھری تو پھینک لہو سے بھرا ہوا

ادائے آڑ میں خنجر کے منہ چھپاتے ہوئے
مری قضا کو وہ لائے دلہن بناتے ہوئے

کسی کا ہائے وہ مقتل میں اس طرح آنا
نظر بچاتے ہوئے آستیں چڑھاتے ہوئے

○

میرؔ و فانیؔ ان شعرا میں ہیں جنہوں نے اپنی ذات کے بارے میں بہت زیادہ اشعار کہے ہیں، خصوصاً دونوں کے مقطعوں میں بڑی یکسانیت ہے، میر صاحب مقطعے میں عموماً اپنی حالت زار یا مزاج دل کا بیان کرتے ہیں اور فانیؔ زندگی اور موت ۲ ـــ دونوں کے مقطعے اتنے مشہور ہیں کہ ان کا اعادہ ضروری نہیں ہے، یہ مقطعے ہیں شاعر کی زندگی اور نظریے کو سمجھنے میں بڑی مدد دیتے ہیں -

فانیؔ ہم تو جیتے جی وہ میت ہیں بے گور و کفن
غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا

خالص شاعرانہ اور جمالیاتی نقطۂ نظر سے دیکھیں تو فانیؔ کی شاعری بڑی کامیاب اور دلکش ہے، میرؔ کی عظمت کا راز یہ ہے کہ وہ دل کی کہانی سناتے وقت بھی خارجی حالات سے الگ تھلگ نہیں معلوم ہوتے، ان کی پریشانی اور ان کا غم اس عہد کے عالمگیر انتشار کا ایک جزو بن کر سامنے آتا ہے، ان کی شاعری میں ایسے اشارے ہیں جو اٹھارہویں صدی کے آخری پچاس ساٹھ برس کے حالات کی جانب ذہن کو منتقل کرتے ہیں، فانیؔ بیسویں صدی کی ذہنی بیداری اور ترقی پسندی سے بے تعلق نظر آتے ہیں، وہ زندگی کے نہیں غم زندگی کے شاعر ہیں، تاہم شعر و ادب کی دنیا میں کچھ

خلوص، اور فنکارانہ صلاحیت کی بڑی قدر و قیمت ہے، اس صدی کے ممتاز غزل گو شعراء کی فہرست ان کے نام کے بغیر قطعی نامکمل رہتی ہے، دنیا کے مسائل حل کرنے کے لئے دنیا میں بہت لوگ ہیں، شاعر کو اتنا حق تو ملنا ہی چاہیے کہ وہ خود اپنی زندگی کو بھی موضوع سخن بنا سکے اور اس کی ترجمانی کر سکے، البتہ اس حق کو استعمال کرتے ہوئے اسے شعر و نغمے کے خوش ذوق پرستاروں کو مایوس نہیں کرنا چاہیئے اور فانی نے ہمیں مایوس نہیں کیا، اس لئے ہمیں ان سے کوئی شکایت نہیں اور ان کی شاعری ہمارے ادب کے قیمتی سرمائے کے طور پر محفوظ رہے گی۔

میر کی مقبولیت

میر اور غزل ہمارے ادب میں مترادف الفاظ بن گئے ہیں، میر کی مقبولیت غزل کی مقبولیت ہے، اور غزل پر اعتراض کرنا، میر پر اعتراض کرنا ہے، میر کی خوش قسمتی سے غزل اردو ادب کی عزیز ترین صنف سخن رہی ہے، نادر شاہ کے حملے سے برصغیر کی تقسیم تک بہت کئی نازک دور بھی گذرے اور کئی بار وہ نرغے میں آ گئی، بدلتی ہوئی زندگی کے تقاضوں کے پیش نظر کئی بار غزل کو ناقص صنف قرار دینے کی کوشش کی گئی، کہتے ہیں کہ سب سے پہلے مرزا غالب نے بیان کی وسعت کے لئے اسے ناکافی جانا اور "تنگنائے غزل" کہہ کر اس کی کوتاہ دامنی کی طرف اشارہ کیا، حالانکہ یہ شعر ایک غزل نما قصیدے کا ہے جو مرزا نے تجمل حسین خان کی خوشنودی کے لئے کہا تھا مرزا صاحب نے اپنی مطلب براری کے لئے اور محنت سے بچنے کی خاطر غزل سے قصیدے کا کام لینا چاہا تھا تو ظاہر ہے کہ انہیں کچھ

نہ کچھ عذر پیش کرنا ضروری تھا، ورنہ چودہ پندرہ شعر کہہ کر قصیدہ اور مدح سرائی کے تقاضے کہاں پورے ہوتے ہیں، غالبؔ جیسے نکتہ داں کے لئے کوئی خوبصورت جواز تلاش کرنا کیا مشکل تھا، انہوں نے وسعت بیان کی زحمت سے بچنے کے لئے غزل کے ظرف کو تنگ قرار دے دیا اور چار شعر مدح کے کہہ کر جان چھڑائی

ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے
سفینہ چاہیئے اس بحر بیکراں کے لئے

ورنہ کون نہیں جانتا کہ غالبؔ نے غزل میں گنجینۂ معنی کا جو طلسم باندھا ہے اور انتہائی بلند اور پیچیدہ خیالات کو جس آسانی کے ساتھ دو مصرعوں میں بیان کر دیا ہے وہ آج بھی باعث رشک ہے ـــــ یہ محض خوش فہمی ہے کہ غالبؔ غزل کو تنگ اور محدود سمجھتے تھے، بادہ و ساغر کے پردے میں مشاہدہ کی حق گفتگو کرنے والا اس فن کا بہت بڑا استاد تھا، تو آسانی کے سوا کوئی اور دشواری اس کے بیان کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتی تھی۔

غالباً یہ کسی قدر غیر متعلق بحث بیچ میں آگئی ـــــ کہنا یہ تھا کہ غزل پر پہلا اعتراض سرسید کے رفیق کار مولانا حالیؔ کی طرف سے ہوا لیکن وہ غزل کے خلاف نہ تھے ان کا مقصد اصلاحی تھا اور ان کے اعتراضات کی بنیاد اخلاقی تھی وہ غزل کے دامن کو وسیع کرنا چاہتے تھے اور بعض فنی پابندیوں میں ترمیم کرنے کے حامی تھے تاکہ خیال و بیان کی راہیں ہموار ہو جائیں، حالیؔ کی نیت اور خلوص میں شبہہ نہیں، تاہم زمانے نے ان کا مشورہ بھی قبول نہیں کیا، اس کے بعد عظمت اللہ خاں کا نام لینا ضروری ہے، جنہوں نے اردو شاعری کی بنیاد ہندی عروض پر رکھنے کی کوشش کی اور غزل کی گردن مار دینے کا

فتوے جاری کیا، ایک زمانے میں ان کے اعتراضات پر خاصی توجہ دی گئی اور ان کے طفیل اردو ادب میں چند اچھی نظموں اور گیتوں کا اضافہ ہوا لیکن غزل اس وار کو بھی سہ گئی، پھر کلیم الدین صاحب نے فنی اعتبار سے اسے ناقص قرار دیا اور غزل کو "نیم وحشی صنفِ سخن" کا نام دیا، کلیم صاحب کی بات میں وزن ضرور تھا لیکن ان کے لہجے کی تلخی کے سبب یہ وزن کافی گھٹ گیا اور ان کی آواز صدا بصحرا ثابت ہوئی، اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ تحریک آزادی، جنگ عظیم اور ترقی پسند تحریک کے دنوں میں غزل کی لَو کبھی کبھی بہت دھیمی ہو گئی لیکن یہ شمع جلتی رہی اور حسرت موہانی جیسے مجاہدوں نے چکی کی مشقت کے ساتھ مشقِ سخن جاری رکھ کر ہزاروں اعتراضات کی عملی تردید کر دی۔

لیکن یہ سمجھنا درست نہیں کہ غزل پر زمانے نے کوئی اثر نہیں ڈالا، غدر کے بعد ہی سے اس کا مزاج بدلنے لگا تھا اور حالی استاد عظیم آبادی اور اقبال سے گذر کر فیض تک پہنچتے پہنچتے غزل کیا سے کیا ہو گئی، بالِ جبریل اور دستِ صبا کی غزلوں کا رنگ و آہنگ اور معنی و مقصد قدیم غزل سے کتنا مختلف ہے، ان تمام خوشگوار تبدیلیوں کے باوجود میر و مرزا اور غالب کی ساحری ختم نہیں ہوئی، اقبال نے غالب کو نذرانہ عقیدت پیش کیا توفیق نے نذر میر و ار کے عنوان سے ان کی غزل پر غزل لکھی   اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کلاسیکی غزل میں کتنا دم خم ہے۔

میر کی غزل کی شہرت اور مقبولیت جو ان کے دور میں تھی آج بھی قائم ہے، غالب، شیفتہ، ذوق، ناسخ، حالی اور حسرت جیسے بڑے شعرا نے میر کی سخنوری کی داد دی اور ان کے کمالِ فن کے سامنے سر جھکایا، میر کے بعد کی کوئی نسل ان

کے اثر سے آزاد نہیں ——— میر کی شاعرانہ شخصیت اور شیوۂ گفتار سے متاثر ہونے والوں میں ایک نام شاد عظیم آبادی کا ہے جن کے بارے میں مولانا سلیمان ندوی لکھتے ہیں "غزل گوئی کے لحاظ سے شاد میں میر کے بہت سے انداز پائے جاتے ہیں، حسن وعشق کی داستان سرائی میں وہی سادگی اور متانت ہے، چھوٹے الفاظ ہیں سادہ ترکیبیں ہیں، بیان میں وہی رفعت ہے میر ہی کے اوزان اور بحور ہیں وہی انداز کلام ہے، وہی فقیرانہ صدا ہے اس لئے شاد کو اس دور سخن کا میر کہا جائے تو بالکل بجا ہے"۔ کبھی کبھی تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میر کی بھٹکتی ہوئی روح ان کے اندر داخل ہو گئی ہے اور نئے دور سے مخاطب ہے مثلاً یہ غزل دیکھئے:

ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم
تعبیر ہے جس کی حسرت و غم اے ہم نفسو وہ خواب ہیں ہم

میں حیرت و حسرت کا مارا خاموش کھڑا ہوں ساحل پر
دریائے محبت کہتا ہے آ کچھ بھی نہیں پایاب ہیں ہم

لاکھوں ہی مسافر چلتے ہیں منزل پہ پہنچتے ہیں دو ایک
اے اہل زمانہ قدر کرو نایاب نہ ہوں کمیاب ہیں ہم

مرغان چمن کو پھولوں نے اے شاد یہ کہلا بھیجا ہے
آجاؤ جو تم کو آنا ہو ایسے میں ابھی شاداب ہیں ہم

○

بیسویں صدی میں ہماری زندگی میں نئی الجھنیں نئے تقاضے اور ہنگامے پیدا ہوئے جن کے زیر اثر نظم نگاری کو بڑا فروغ حاصل ہوا، اس عہد کے دو عظیم ترین شعراء اقبال اور جوش نے پوری نسل کو متاثر کیا، خود غزل بھی نظم سے کافی متاثر ہوئی خاص طور پر اس کی رمزیت اور ایمائیت

میں بڑا اضافہ ہوا۔ گل و بلبل اور شمع و پروانہ کے معنی و مفہوم بدل گئے، پیمانے وہی رہے مگر شراب نئی آگئی، زندگی میں غمِ دوراں کی تلخی بڑھی تو غزل نے اس غم کو بھی اپنے دل میں جگہ دی میر صاحب جو غمِ عشق اور غمِ زندگی دونوں کے مزاج داں تھے اس دور میں بھی ہر دلعزیز رہے

اس مقبولیت کا راز یہ ہے کہ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کے الفاظ میں ــــ "میر کے یہاں اردو غزل آبگینے کی نزاکت کے ساتھ جلوہ گر ہے، اس میں سوز و گداز، درد و یاس، حسرت و ملال کے علاوہ اور بھی بہت کچھ ہے، غمِ جاناں اور غمِ دوراں کا شاید ہی کوئی پہلو ہو جسے میر نے نظر انداز کیا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا غم ذاتی اور انفرادی ہونے کے باوجود بڑا آفاقی نظر آتا ہے اور یہ اسی آفاقیت کا نتیجہ ہے کہ میر آج تک مقبول اور ہمارے شعراء کا محبوب ہے اور آج تک اس کی متروک بولی بھی پیاری لگتی ہے اور اس کی تقلید کی جاتی ہے"۔

میر کے بنائے ہوئے راستے پر چلنے کی خواہش اور کوشش بہتوں نے کی مگر میر کی تقلید کا حق ادا کرنا آسان نہیں ہے، کیونکہ ان کی شاعری محض شیوۂ گفتار یا الفاظ کی بازیگری نہیں ہے، اس کے پیچھے میر کی وہ عظیم شخصیت ہے جو زمانے کے سرد و گرم سے آشنا ہے اور اپنے مزاج کی کیفیتوں کو شعر میں منتقل کر دینے کی قدرت رکھتی ہے۔ نئے دور کے کئی شعراء نے میر کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کی اور زبان بیان کی دلکشی کے لئے ہندی شاعری کے لب و لہجے سے بہت کچھ لیا ہے، بعض نے اپنے سلیقے سے نئی آواز بھی پیدا کی اور انہیں انفرادیت کی سند مل گئی، ایسے بہت سے شعراء میں سے ہم اپنی سہولت کے لئے تین نام لیتے ہیں جنہوں نے میر صاحب کی روایت کو اپنایا، میراجی، ابن انشاء اور ناصر کاظمی ــــ ان میں سے آخری نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے، ناصر کاظمی کی غزلوں میں میر کا نہ صرف رنگ و آہنگ موجود ہے بلکہ وہ مزاج و ذہن کے اعتبار سے بھی میر صاحب کے قریب معلوم ہوتے

ہیں انہوں نے میر کے سادہ و پرکار انداز کے ساتھ ساتھ ان کے پرسوز اور دھیمے لہجے کو بھی اپنانے کی کوشش کی ہے ابن انشاء نے بھی اپنی غزلوں اور نظموں میں میر جی کے شیوۂ گفتار کی تقلید کی ہے اور ایک نئی فضا قائم کی ہے، میرا جی تو آشفتہ مزاجی اور انفرادیت پسندی میں شاید میر صاحب سے بھی دو قدم آگے تھے، ان پر میر کا سایہ نہ پڑتا تو حیرت کی بات ہوتی، ذیل کی چند مثالوں سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ میر کے نقش قدم پر چلنے والوں میں کون کہاں تک پہنچا ہے

میرا جی:

غم کے بھروسے کیا کچھ چھوڑا، کیا اب تم سے بیان کریں
غم بھی راس نہ آیا دل کو اور ہی کچھ سامان کریں

مجبوروں کی مختاری سے دوری اچھی ہوتی ہے
مل بیٹھیں تو سیادا دونوں باہم کچھ احسان کریں

میر ملے تھے میرا جی سے باتوں سے ہم جان گئے
فیض کا چشمہ جاری ہے حفظ ان کا بھی دیوان کریں

○

ابن انشاء:

دل سی چیز کے گاہک ہوں گے دو یا ایک ہزار کے بیچ
انشاء جی کیا مال لئے بیٹھے ہو تم بازار کے بیچ

منتِ قاصد کون اٹھائے، شکوۂ درباں کون کرے
نامۂ شوق غزل کی صورت، چھپنے دو اخبار کے بیچ

○

قیس کا نام سنا ہے تم نے ہم سے اب ملاقات کرو
عشق و جنوں کی منزل مشکل، سب کی یہ اوقات کہاں

پیٹ کا کاروبار بہت ہے، اب تو اور بھی پھیل چلا
اور جو کام جہاں کے دیکھیں فرصت دیں حالات کہاں

○

ناصر کاظمی: آج غربت میں بہت یاد آیا
اے وطن تیرا صنم خانۂ گل

آج ہم خاک بسر پھرتے ہیں
ہم سے تھی رونق کاشانۂ گل

ہم پہ گزرے ہیں خزاں کے صدمے
ہم سے پوچھے کوئی افسانۂ گل

○

میں سو رہا تھا کسی یاد کے شبستاں میں
جگا کے چھوڑ گئے قافلے سحر کے مجھے

ترے فراق کی راتیں کبھی نہ بھولیں گی
مزے ملے انہیں راتوں میں عمر بھر کے مجھے

○

کچھ تو احساسِ زیاں تھا پہلے
دل کا یہ حال کہاں تھا پہلے

یوں نہ گھبرائے ہوئے پھرتے تھے
دل عجب کنجِ اماں تھا پہلے

اب وہ دریا نہ وہ بستی نہ وہ لوگ
کیا خبر کون کہاں تھا پہلے

ہر خرابہ یہ صدا دیتا ہے
میں بھی آباد مکاں تھا پہلے

کیا سے کیا ہو گئی دنیا پیارے
تو وہیں پر ہے جہاں تھا پہلے

○

یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ میر تقی میر کی شاعری کے ساتھ ان کے نام اور تخلص میں بھی خاص کشش محسوس کی گئی۔ میر اپنی غزلوں خصوصاً مقطع میں خود کو کبھی میر صاحب اور کبھی میر جی کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔ آشفتہ طبع میر کا یہ انداز بھی نئی نسل کے شعرا کو بہت بھایا اور انہوں نے اپنے ناموں میں جی اور صاحب کا اضافہ کر لیا، یہ بھی میر پرستی کی ایک علامت ہے اور میر کی شاعرانہ شخصیت کے دور رس اثرات کی نشانی ہے، یہ روش عام ہوتی جا رہی ہے، اس لیے اس سلسلے میں یہ کہنے کی ضرورت ہے کہ جس طرح کوئی داڑھی بڑھا کر سر سید نہیں بن سکتا اسی طرح نام یا سادہ زبان اختیار کر کے کوئی میر (کا) ہم زبان نہیں بن سکتا، میر کی غزل میں جو سوزِ دل اور خونِ جگر اور الم آشنا مزاج شامل ہے اس کے بغیر میر کا شیوۂ گفتار نصیب نہیں ہو سکتا

بے سوزِ دلِ کنہوں کہا ریختہ تو کیا
گفتار خام پیشِ عزیزاں سند نہیں

میرؔ کی شاعری کے پیچھے ان کا طویل تجربہ اور گہرا مشاہدہ اور ان کی گمبھیر شخصیت ہے۔ اس کے علاوہ وہ علمی قابلیت فنی ریاضت اور سلیقۂ شاعرانہ کو بھی کمال فن کے لئے ضروری خیال کرتے تھے اپنی نسل کے شاعروں کو ابھی میرؔ سے بہت کچھ سیکھنا ہے میرؔ کو یہ دولتِ بیدار اور عالمگیر مقبولیت دیدہ و دل کا خون کرنے کے بعد ہی حاصل ہوئی ہے۔ ان کا فن ان کی زندگی اور شخصیت سے وابستہ ہے اس لئے میرؔ کی غزل کا مطالعہ کرنے والوں اور میرؔ کے شیوہ گفتار کی آرزو رکھنے والوں کو میرؔ کی شخصیت اور شاعری دونوں پر یکساں توجہ دینی چاہیئے کیونکہ میرؔ نے کہا تھا ان کا فن ان کی شخصیت کا اظہار ہے:

کیا تھا شعر کو پردہ سخن کا
سو اب ٹھہرا یہی ہے فن ہمارا

نگاہِ انتخاب:

شعروں کے انتخاب سے دل کا معاملہ کھلے یا نہ کھلے رسوائی کا ڈر ضرور رہتا ہے کیونکہ یہ ایک ذاتی معاملہ ہے اور شعروں کے انتخاب میں کوئی شخص اپنے ذوق اور مزاج سے دست بردار نہیں ہو سکتا، مذاق سخن اور تنقیدی ذوق کے ذرا سے اختلاف کی وجہ سے کبھی کبھی ایک کی پسند دوسرے کی ناپسند بن جاتی ہے، حد یہ ہے کہ ایک بہترین شاعر بھی بہترین انتخاب کا دعوےٰ نہیں کر سکتا، بقول نیاز فتحپوری

"میر کو دنیا خدائے سخن مانتی ہے لیکن جب یہ خدائے سخن اپنے کلام کا انتخاب کرتا ہے تو پیغمبری کے درجے سے بھی گرا ہوا نظر آتا ہے اور خدا سے مطلق خبر نہیں ہوتی کہ اس کے بہترین اشعار کون سے ہیں"۔

موجودہ انتخاب میں یہ خیال رکھا گیا ہے کہ کلیات میر سے ایسے اشعار نکالے جائیں جو میر کی زندگی، شخصیت اور شاعری کی نمائندگی کرتے ہوں، اور ان کے مزاج اور ماحول کو سمجھنے کے لئے اشارے کا کام دیں، اس سے پہلے بھی میر کے کئی انتخاب شائع ہو چکے ہیں اور آئندہ بھی یہ سلسلہ جاری رہے گا کلیات میر سب سے پہلے فورٹ ولیم کالج سے ۱۸۱۱ء میں شائع ہوا تھا اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اشاعت کے بعد ہی سے انتخاب کا سلسلہ چل نکلا، خطوط غالب میں بھی ایک انتخاب کا ذکر آیا ہے، سیف الحق سیاح

کے نام ۲۵ فروری ۱۸۶۸ء کے مراسلے میں مرزا غالب لکھتے ہیں" کلیات میر تقی کا انتخاب تمہارے خط کے پہنچنے سے دو دن پہلے میر فخرالدین نے ارسال کر دیا"۔

———— اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کلیات میر کے انتخاب کی ضرورت بہت پہلے محسوس کر لی گئی تھی۔

جن صاحبِ ذوق اور جوہا مند لوگوں نے شروع سے آخر تک میر کا سارا کلام پڑھا ہے وہ مولانا آزردہ کے اس خیال سے اتفاق کریں گے کہ" بلندش بغایت بلند وپستیش بغایت پست ۔۔" بلندی و پستی سے قطع نظر میر کا کلیات اتنا بھاری ہے جسے ہر آدمی نہیں اٹھا سکتا اور زندگی کے اس مصروف دور میں پورا کلیات پڑھنے کی توفیق گنتی کے لوگوں کو نصیب ہو سکتی ہے، اس لئے بھی انتخاب کی ضرورت اور اہمیت بہت زیادہ ہے، اس انتخاب کا مقصد یہی ہے کہ میر کا قابلِ توجہ کلام سامنے آجائے اور باقی حصہ ان لوگوں کے لئے چھوڑ دیا جائے جو تحقیق اور تنقید کے مرد میدان ہیں، مرزا غالب کی دور اندیشی کی داد دینی چاہئے کہ انہوں نے اپنی زندگی میں اپنے کلام کا انتخاب کیا اور اپنے ذہن کی کتنی تخلیقات کو خود قلم زد کر دیا، وہ جانتے تھے کہ آنے والے دور میں جب روایت اور عقیدت پر تنقیدی شعور غالب آجائے گا تو صرف کھرے سکے رائج رہیں گے۔ لیکن دلچسپ بات تو یہ ہے کہ غالب کی اس احتیاط اور پیش بندی کے باوجود، اہل ذوق اب بھی دیوانِ غالب کا مزید انتخاب کرنے میں کوئی تکلف محسوس نہیں کرتے ——— پھر میر کا کیا تذکرہ کیا جائے جن کا کلیات بلاشبہ ایک بحرِ زخار ہے، جس میں غوطہ لگا کر ہی موتی نکالے جا سکتے ہیں۔

میر صاحب کم و بیش نوے برس اس عالم رنگ و بو کی سیر کرتے رہے ستر

اسّی برس کی شاعرانہ زندگی میں انہوں نے کیا کچھ نہ کہا ہوگا، یہ سب کچھ موجودہ کلیات میں محفوظ ہے۔ آئندہ بھی میر صاحب کے غیر مطبوعہ کلام دریافت ہونے کے امکانات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، بہر حال انتہائی عقیدت کے باوجود میر کے ہر شعر کے لئے ہمارے دل میں جگہ نہیں نکل سکتی، انہیں پستی کے عالم میں دیکھ کر ہماری طبیعت خوش نہیں ہوتی۔ البتہ جب وہ اپنے مزاج کی آشفتگی اور فن کی نزاکت کے ساتھ ایک شعر کہہ دیتے ہیں تو وہ دل پر نقش ہو جاتا ہے، اس انتخاب میں آپ کو اول اور دوم درجے کے شعر ملیں گے تیسرے اور چوتھے درجے کا کلام پڑھ کر آپ کو کیا ملے گا، کلیات میر میں محفوظ رہنے دیجئے تاکہ سند رہے اور وقت ضرورت کام آئے۔

میر نے غزل، قصیدہ، ہجو، مرثیہ اور مثنوی سب ہی کچھ لکھا ہے، ان کی بعض مثنویاں مثلاً شعلۂ عشق، دریائے عشق اور خواب و خیال کافی مشہور ہیں تاہم میر کی شاعرانہ عظمت ان کی غزل کی بدولت ہے، بلکہ ان کی مثنویوں کے اثر انگیز حصے بھی وہی ہیں جن میں تغزل کا رنگ جھلکتا ہے، غزل کے بغیر میر تقی کی حیثیت میر اثر سے زیادہ نہیں ہوسکتی تھی، سخن میں خدائی کا درجہ انہیں غزل گوئی کی بنا پر حاصل ہوا، اس خیال کے پیش نظر ہم نے زیادہ تر غزلیات کا انتخاب اس مجموعے شامل کیا ہے، البتہ ان کی بعض ہجویات و مثنویات اور واسوخت کے خاص خاص حصے منتخب کیے گئے ہیں تاکہ ان کی زندگی اور مزاج کو سمجھنے میں آسانی ہو، میر کی غزلوں کے کل چھ دیوان ہیں جن کا انتخاب کیا گیا ہے اس انتخاب میں اگر میر صاحب کا چہرہ نظر آجائے اور ان کے لب و لہجے سے کان آشنا ہو جائیں تو انتخاب کا مقصد پورا ہو جاتا ہے۔

معاون کتابیں

اردو شاعری پر ایک نظر ——— کلیم الدین احمد

اردو تنقید پر ایک نظر ——— کلیم الدین احمد

اردو کا تنقیدی سرمایہ ——— گل خنداں لاہور مرتب عابد علی عابد

اردو غزل گوئی ——— فراق گورکھپوری

اردوئے معلّیٰ ——— خطوط مرزا غالب

اردو زبان اور ادب ——— ڈاکٹر مسعود حسین

ادب اور نظریہ ——— آل احمد سرور

ادب اور شعور ——— ممتاز حسین

اندازے ——— فراق گورکھپوری

افکارِ غالب ——— ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم

انتخاب حسرت ——— جلیل قدوائی

انتخاب سودا ——— ثاقب کانپوری

انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ ——— عبداللہ یوسف علی

آب حیات ——— مولانا محمد حسین آزاد

ایلیٹ کے مضامین ——— جمیل جالبی

بزمِ تیموریہ ——— عبدالرحمٰن صباح الدین

تنقیدی حاشیے ——— مجنوں گورکھپوری

تذکرہ نکات الشعراء ——— میر تقی میر

تذکرہ شعرائے اردو ——— میر حسن دہلوی

تذکرہ گلشن بیخار ——— مصطفےٰ خان شیفتہ

تذکرہ گلِ رعنا ——— حکیم عبدالحیٔ

جراتؔ، ان کا عہد اور شاعری ——— ڈاکٹر ابواللیث صدیقی

حکیم فرزانہ ——— ایس۔ ایم۔ اکرام

دیوانِ غالب ——— تاج کمپنی کراچی

شبابِ لکھنؤ ——— عبدالاحد۔ بی، اے

شعرالہند ——— سید سلیمان ندوی

عرفانیاتِ فانی ——— فانی بدایونی

غزل اور متغزلین ——— ڈاکٹر ابواللیث صدیقی

غالب نامہ ——— ایس ایم۔ اکرام

غزل ——— یوسف حسین

کلیاتِ سودا ——— مطبع نولکشور لکھنؤ

کلیاتِ میر ——— اردو دنیا، کراچی

ماہنامہ ساقی ——— میر نمبر۔ مرتبہ حسن عسکری

مقدمہ شعر و شاعری ——— مولانا الطاف حسین حالی

میر تقی میر حیات اور شاعری ——— ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی

مختصر تاریخ ہند و پاکستان ——— پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی

نقوش لاہور ——— غزل نمبر

نئے اور پرانے چراغ ——— آل احمد سرور

ہسٹری آف برٹش انڈیا (انگریزی) ——— آکسفورڈ یونیورسٹی پریس ۱۹۵۲ء

یادگار غالب ——— مولانا الطاف حسین حالی

لکھے گئے بیاضوں میں اشعار انتخاب
رنگین ہوئے وہی کہ جو سکے کھرے ہوئے
(آتش)

انتخاب

کلیاتِ میر

انتخاب

کُلیاتِ میرؔ

دیوانِ اوّل

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الف

تھا مُستعار حُسن سے اُس کے جو نور تھا
خورشید میں بھی اُس ہی کا ذرہ ظہور تھا

ہنگامہ گرم کُن جو دلِ ناصبور تھا
پیدا ہر ایک نالے سے شورِ نشور تھا

پہنچا جو آپ کو تو میں پہنچا خدا کے تئیں
معلوم اب ہوا کہ بہت میں بھی دور تھا

آتش بلند دل کی نہ تھی ورنہ اے کلیم!
یک شعلہ برقِ خرمنِ صد کوہِ طور تھا

مجلس میں رات ایک ترے پرتوے بغیر
کیا شمع کیا پتنگ ہر اک بے حضور تھا

کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر جو آگیا
قطعہ
یک سر وہ استخوان شکستے سے چور تھا

کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر
میں بھی کبھو کسو کا سرِ پُر غرور تھا

تھا وہ تو رشکِ حورِ بہشتی ہمیں میں میرؔ
سمجھے نہ ہم تو فہم کا اپنی قصور تھا

کیا میں بھی پریشانیٔ خاطر سے قریں تھا
آنکھیں تو کہیں تھیں دلِ غم دیدہ کہیں تھا

کس رات نظر کی ہے سوئے چشمکِ انجم
آنکھوں کے تلے اپنے تو وہ ماہ جبیں تھا

آیا تو سہی وہ کوئی دم کے لئے لیکن
ہونٹوں پہ مرے جب نفسِ باز پسیں تھا

جانا نہیں کچھ جز غزل آکر کے جہاں میں — کل میرے تصرف میں یہی قطعہ زمیں تھا

مسجد میں امام آج ہوا آکے کہاں سے
کل تک تو یہی میر خرابات نشیں تھا

کفر کچھ چاہیے اسلام کی رونق کیلئے — حسنِ زُنار ہے تسبیحِ سلیمانی کا
درہمی حال کی ہے سارے مرے دیوان میں — سیر کر تو بھی یہ مجموعہ پریشانی کا
جان گھبراتی ہے اندوہ سے تن میں کیا کیا — تنگ احوال ہے اس یوسف زندانی کا
اس کا منہ دیکھ رہا ہوں سو وہی دیکھوں ہوں — نقش کا سا ہے سماں میری بھی حیرانی کا

بُت پرستی کو تو اسلام نہیں کہتے ہیں
معتقد کون ہے میر ایسی مسلمانی کا

جامۂ ہستیٔ عشق اپنا مگر کم گھیر تھا — دامنِ تر کا مرے دریا ہی کا سا پھیر تھا
دیر میں کعبے گیا میں خانقہ سے اب کی بار — راہ سے میخانے کی اس راہ میں کچھ پھیر تھا

بلبلوں نے کیا گل افشاں میر کا مرقد کیا
دور سے آیا نظر تو پھولوں کا اک ڈھیر تھا

اِس عہد میں الٰہی محبت کو کیا ہوا — چھوڑا وفا کو اُن نے مروت کو کیا ہوا
اُمیدوار وعدۂ دیدار مر چلے — آتے ہی آتے یارو قیامت کو کیا ہوا
اُٹھ کے گئے پر ایسی گئی دل سے ہم نشیں! — معلوم بھی ہوا نہ کہ طاقت کو کیا ہوا

بخشش نے مجھ کو ابرِ کرم کی کیا خجل
اے چشمِ جوش اشکِ ندامت کو کیا ہوا
جاتا ہے یار تیغ بکف غیر کی طرف
اے کشتۂ ستم تری غیرت کو کیا ہوا

کہا میں نے کتنا ہے گُل کا ثبات؟
کلی نے یہ سُن کر تبسّم کیا
جگر ہی میں یک قطرہ خوں ہے سرشک
پلک تک گیا تو تلاطُم کیا
کسو وقت پاتے نہیں گھر اسے
بہت میؔر نے آپ کو گم کیا

اُلٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماریٔ دل نے آخر کام تمام کیا
عہد جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند
یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا
حرف نہیں جاں بخشی میں اُس کی خوبی اپنی قسمت کی
ہم سے جو پہلے کہ بھیجا سو مرنے کا پیغام کیا
ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا
سرزد ہم سے بے ادبی تو وحشت میں بھی کم ہی ہوئی
کوسوں اس کی اُور گئے پر سجدہ ہر ہر گام کیا
کس کا کعبہ، کیسا قبلہ، کون حرم ہے، کیا احرام

کوچے کے اس کے باشندوں نے سب کو یہیں سے سلام کیا

یاں کے سپید و سیہ میں ہم کو دخل جو ہے سو اتنا ہے
رات کو رو رو صبح کیا اور دن کو جوں توں شام کیا

ساعدِ سیمیں دونوں اس کے ہاتھ میں لاکر چھوڑ دیے
بھولے اس کے قول و قسم پر ہائے خیالِ خام کیا

ایسے آہوئے رم خوردہ کی وحشت کھونی مشکل تھی
سحر کیا، اعجاز کیا، جن لوگوں نے تجھ کو رام کیا

میر کے دین و مذہب کو اب پوچھتے کیا ہو اُن نے تو
قشقہ کھینچا دَیر میں بیٹھا، کب کا ترک اسلام کیا

چمن میں گل نے جو کل دعویٔ جمال کیا
جمالِ یار نے منہ اس کا خوب لال کیا

فلک نے آہ تری رہ میں ہم کو پیدا کر
برنگِ سبزۂ نو رستہ پائمال کیا

بہارِ رفتہ پھر آئی ترے تماشے کو
چمن کو یُمنِ قدم نے ترے نہال کیا

لگا نہ دل کو کہیں کیا سُنا نہیں تو نے
جو کچھ کہ میر کا اس عاشقی نے حال کیا

مُنعم نے بنا ظلم کی رکھ گھر تو بنایا
پر آپ کوئی رات ہی مہمان رہے گا

جانے کا نہیں شورِ سخن کا مرے ہرگز
تا حشر جہاں میں مرا دیوان رہے گا

دِل دینے کی ایسی حرکت اُن نے نہیں کی
جبتک جئے گا میر پشیمان رہے گا

بے ہوش مئے عشق ہوں کیا میرا بھروسا — آیا جو بخود صبح تو میں شام نہ آیا
اب کے جو ترے کوچے سے جاؤں گا تو سنیو — پھر جیتے جی اس راہ وہ بدنام نہ آیا
نے خون ہو آنکھوں سے بہا ٹک نہ ہوا داغ
اپنا تو یہ دل میر کسو کام نہ آیا

جس سر کو غرور آج ہے یاں تاج وری کا — کل اس پہ یہیں شور ہے پھر نوحہ گری کا
آفاق کی منزل سے گیا کون سلامت — اسباب لٹا راہ میں یاں ہر سفری کا
زنداں میں بھی شورش نہ گئی اپنے جنوں کی — اب سنگ مداوا ہے اس آشفتہ سری کا
ہر زخم جگر داور محشر سے ہمارا — انصاف طلب ہے تری بیدادگری کا
اپنی تو جہاں آنکھ لڑی پھر وہیں دیکھو — آئینے کو لپکا ہے پریشاں نظری کا
صد موسم گل ہم کو تہ بال ہی گزرے — مقدور نہ دیکھا کبھو بے بال و پری کا
اس رنگ سے جھمکے ہے پلک پر کہ کہے تو — ٹکڑا ہے ترا اشک عقیق جگری کا
لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام — آفاق کی اس کارگہ شیشہ گری کا
ٹک میر جگر سوختہ کی جلد خبر لے
کیا یار بھروسا ہے چراغ سحری کا

منہ تکا ہی کرے ہے جس تس کا — حیرتی ہے یہ آئینہ کس کا
شام سے کچھ بجھا سا رہتا ہے — دل ہوا ہے چراغ مفلس کا
داغ آنکھوں سے کھل رہے ہیں سب — ہاتھ دستہ ہوا ہے نرگس کا

تاب کس کو جو حالِ میرؔ سُنے
حال ہی اور کچھ ہے مجلس کا

وہ اک روش سے کھولے ہوئے بال ہو گیا
سنبل چمن کا مفت میں پامال ہو گیا

اُلجھاؤ پڑ گیا جو ہمیں اس کے عشق میں
دل سا عزیز جان کا جنجال ہو گیا

قامت خمیدہ، رنگ شکستہ، بدن نزار
تیرا تو میرؔ غم میں عجب حال ہو گیا

دل کا نہیں ٹھکانا بابت جگر کی گم ہے
تیرے بلاکشوں کا ہم نے حساب دیکھا

آباد جس میں تجھ کو دیکھا تھا ایک مدت
اُس دل کی مملکت کو اب ہم خراب دیکھا

لیتے ہی نام اس کا سوتے سے چونک اُٹھے ہو
ہے خیر میرؔ صاحب! کچھ تم نے خواب دیکھا

جب جنوں سے ہمیں توسّل تھا
اپنی زنجیرِ پائی کا غُل تھا

یک نگہ کو وفا نہ کی گویا
موسمِ گُل صفیرِ بُلبُل تھا

اُن نے پہچان کر ہمیں مارا
منہ نہ کرنا ادھر تجاہل تھا

اب تو دل کو نہ تاب ہے نہ قرار
یادِ ایام جب تحمّل تھا

خوب دریافت جو کیا ہم نے
وقتِ خوش میرؔ نکہتِ گُل تھا

اُس ماہِ چاردہ کا چھپے عشق کیونکہ آہ
اب تو تمام شہر میں مشہور ہو گیا

شاید کسو کے دل کو لگی اُس گلی میں چوٹ
میری بغل میں شیشۂ دل چور ہو گیا

دیکھا جو میں نے یار تو وہ میرؔ ہی نہیں
تیرے غمِ فراق میں رنجور ہو گیا

دِل تاب ہی لایا نہ ٹک تا یاد رہتا ہم نشیں
اب عیش روزِ وصل کا ہے جی میں بھولا خواب سا

سنّاٹے میں جان کے ہوش و حواس دم نہ تھا
اسباب سارا لے گیا آیا تھا اک سیلاب سا

ہم سرکشی سے مدتوں مسجد سے بچ بچ کر چلے
اب سجدے ہی میں گزرے ہے قد جو ہوا محراب سا

تھی عشق کی وہ ابتدا جو موج سی اُٹھی کبھو
اب دیدۂ تر کو جو تم دیکھو تو ہے گرداب سا

رکھ ہاتھ دل پر میرؔ کے دریافت کر کیا حال ہے؟
رہتا ہے اکثر یہ جواں کچھ اِن دنوں بیتاب سا

مر رہتے جو گُل بن تو سارا یہ خلل جاتا
نکلا ہی نہ جی ورنہ کانٹا سا نکل جاتا

بے تاب و تواں یوں میں کاہے کو تلف ہوتا
یاقوتی ترے لب کی ملتی تو سنبھل جاتا

میں گریۂ خونی کو رُوکے ہی رہا ورنہ
یک دم میں زمانے کا یاں رنگ بدل جاتا

بن پوچھے کرم سے وہ جو بخش نہ دیتا تو
پرسش میں ہماری ہی دِن حشر کا ڈھل جاتا

مانندِ شمعِ مجلس شب اشک بار پایا
القصہ میرؔ کو ہم بے اختیار پایا

شہرِ دل ایک مدت اُجڑا بسا غموں میں
آخر اجاڑ دینا اُس کا قرار پایا

اتنا نہ تجھ سے ملتے نہ دل کو کھو کے روتے　　جیسا کیا تھا ہم نے ویسا ہی یار پایا
کیا اعتباریاں کا پھر اُس کو خوار دیکھا　　جس نے جہاں میں آ کر کچھ اعتبار پایا
آہوں کے شعلے جس جا اُٹھتے تھے میرؔ سے شب
واں جا کے صبح دیکھا مشتِ غبار پایا

اُس گل زمیں سے اب تک اُگتے ہیں سرو جس جا　　مستی میں جھکتے جس پر تیرا پڑا ہے سایا
تا چرخ نالہ پہنچا لیکن اثر نہ دیکھا　　کرنے سے اب دُعا کے میں ہاتھ ہی اُٹھایا

ناحق یہ ظلم کرنا انصاف کر پیارے　　ہے کون سی جگہ کا، کس شہر کا، کہاں کا
یاروئے یار لایا اپنی تو یوں ہی گذری　　کیا ذکر ہم صفیراں یارانِ شادماں کا
قیدِ قفس میں ہیں تو خدمت ہے نالگی کی　　گلشن میں تھے تو ہم کو منصب تھا روضہ خواں کا
پُوچھو تو میرؔ سے کیا کوئی نظر پڑا ہے
چہرہ اُتر رہا ہے کچھ آج اس جواں کا

ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا　　دلِ ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا
مرے سلیقے سے میری نبھی محبت میں　　تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا
اگرچہ گوشہ گزیں ہوں میں شاعروں میں میرؔ
پہ میرے شور نے روئے زمیں تمام لیا

تیر کے قابل ہے دل صد پارہ اس نخچیر کا — جس کے ہر ٹکڑے میں ہو پیوست پیکاں تیر کا
سب کھلا باغِ جہاں الّا یہ حیران و خفا — جس کو دل سمجھے تھے ہم سو غنچہ تھا تصویر کا
کیونکہ نقاشِ ازل نے نقشِ ابرو کا کیا — کام ہے اک تیرے منہ پر کھینچنا شمشیر کا
رہ گزرِ سیلِ حوادث کا ہے بے بنیاد دہر — اس خرابے میں نہ کرنا قصد تم تعمیر کا
بس طبیب اٹھ جا مری بالیں سے مت دے دردِ سر — کام جاں آخر ہوا اب فائدہ تدبیر کا
نالہ کش ہیں عہدِ پیری میں بھی تیرے در پہ ہم — قدِ خم گشتہ ہمارا حلقہ ہے زنجیر کا

کس طرح سے مانیے یارو! کہ یہ عاشق نہیں
رنگ اڑا جاتا ہے ٹک چہرہ تو دیکھو میر کا

موجیں کرے ہے بحر جہاں میں ابھی تو تو — جانے گا بعدِ مرگ کہ عالم حباب تھا
اُگتے تھے دستِ بلبل و دامانِ گل بہم — صحنِ چمن نمونۂ یوم الحساب تھا
ٹک دیکھ آنکھیں کھول کے اس دم کی حسرتیں — جس دم یہ سوجھے گی کہ یہ عالم بھی خواب تھا

پائمالِ صد جفا ناحق نہ ہو اے عندلیب! — سبزۂ بیگانہ بھی تھا اس چمن کا آشنا
گو گل و لالہ کہاں سنبل سمن ہم نسترن — خاک سے یکساں ہوئے ہیں ہائے کیا کیا آشنا
کیا کروں کس سے کہوں اتنا ہی بیگانہ ہے یار — سارے عالم میں نہیں پاتے کسی کا آشنا
شعرِ صائب کا مناسب ہے ہماری اور سے — سامنے اس کے پڑھے گر یہ کوئی جا آشنا
تا بجاں ما ہمرہیم و تا بمنزل دیگراں — فرق باشد جانِ ما از آشنا نا آشنا
داغ ہے تاباں علیہ الرحمہ کا چھاتی پہ میر — ہو نجات اس کو بچارا ہم سے بھی تھا آشنا

گُل کو محبوب ہم قیاس کیا — فرق نکلا بہت جو باس کیا
دِل نے ہم کو مثالِ آئینہ — ایک عالم کا روشناس کیا
کچھ نہیں سُوجھتا ہمیں اُس بن — شوق نے ہم کو بے حواس کیا
عشق میں ہم ہوئے نہ دیوانے — قیس کی آبرُو کا پاس کیا
صبح تک شمع سر کو دُھنتی رہی — کیا پتنگے نے التماس کیا

ایسے وحشی کہاں ہیں اے خوباں
میرؔ کو تم عبث اُداس کیا

مفت آبروئے زاہد علامہ لے گیا — اک مُغ بچہ اُتار کے عمامہ لے گیا
داغِ فراق و حسرتِ وصل آرزوئے شوق — میں ساتھ زیرِ خاک بھی ہنگامہ لے گیا

لے تو کہ یاں سے عاقبتِ کار جائے گا — غافل نہ رہ کہ قافلہ اک بار جائے گا
موقوف حشر پر ہی سو آتی بھی وہ نہیں — کب درمیاں سے وعدۂ دیدار جائے گا
آئے بن اُس کے حال ہوا جائے ہے تغیر — کیا حال ہوگا پاس سے جب یار جائے گا

جو سُنا ہشیار اس میخانے میں تھا بے خبر — شوق ہی باقی رہا ہم کو دلِ آگاہ کا
باندھ مت رونے کا تار اِی ناقباحت نم چشم — اس سے پایا جائے ہے سر رشتہ جی کی چاہ کا

کس کو نہیں ہے شوق ترا پر نہ اس قدر — میں تو اسی خیال میں بیمار ہو گیا

میں نو دمیدہ بال چمن زاد طیر تھا — پر گھر سے اُٹھ چلا سو گرفتار ہو گیا
ہے اُس کی حرفِ زیرلبی کا سبھوں میں ذکر — کیا بات تھی کہ جس کا یہ بستار ہو گیا
کب رُو ہے اُس سے بات کے کرنے کا مجھ کو میرؔ
ناکردہ جرم میں تو گنہ گار ہو گیا

ہم خستہ دل ہیں تجھ سے بھی نازک مزاج تر — تیوری چڑھائی تو نے کہ یاں جی نکل گیا
گرمیِ عشق مانعِ نشو و نما ہوئی — میں وہ نہال تھا کہ اُگا اور جل گیا
مستی میں چھوڑ دیر کو کعبے چلا تھا میں — لغزش بڑی ہوئی تھی و لیکن سنبھل گیا

ملا ہے خاک میں کس کس طرح کا عالم یاں — نکل کے شہر سے ٹک سیر کر مزاروں کا
علاج کرتے ہیں سودائے عشق کا میرے — خلل پذیر ہوا ہے دماغ یاروں کا
تڑپ کے مرنے سے دل کے کہ مغفرت ہو اسے — جہاں میں کچھ تو رہا نام بے قراروں کا
تڑپ کے خرمنِ گل پر کبھی گر اے بجلی! — جلانا کیا ہے مرے آشیاں کے خاروں کا
تمہیں تو زہد و ورع پر بہت ہے اپنے غرور — خدا ہے، شیخ جی! ہم بھی گناہ گاروں کا

گزرا بنائے چرخ سے نالہ پگاہ کا — خانہ خراب ہو جیو اس دل کی چاہ کا
آنکھوں میں جی مرا ہے اِدھر دیکھتا نہیں — مرتا ہوں میں تو ہائے رے صرفہ نگاہ کا
اک قطرہ خون ہو کے پلک سے ٹپک پڑا — قصہ یہ کچھ ہوا دلِ غفراں پناہ کا
بدنام و خوار و زار و نزار و شکستہ حال — احوال کچھ نہ پوچھیے اس رُوسیاہ کا

ظالم زمیں سے لوٹتا دامن اُٹھا کے چل — ہوگا کمیں میں ہاتھ کسو داد خواہ کا
اے تاج شہ نہ سر کو فرو لاؤں تیرے پاس — ہے معتقد فقیر نمد کی کُلاہ کا

دل سے شوقِ رُخِ نکو نہ گیا — جھانکنا تاکنا کبھو نہ گیا
ہر قدم پر تھی اُس کی منزل لیک — سر سے سودائے جستجو نہ گیا
سب گئے ہوش و صبر و تاب و تواں — لیکن اے داغ دل سے تو نہ گیا
دل میں کتنے مسودے تھے ولے — ایک پیش اس کے روبرو نہ گیا

سبحہ گرداں ہی میر ہم تو رہے
دستِ کوتاہ تا سبو نہ گیا

گل و بلبل بہار میں دیکھا — ایک تجھ کو ہزار میں دیکھا
تیرہ عالم ہوا یہ روز سیاہ — اپنے دل کے غبار میں دیکھا

جن بلاؤں کو میر سنتے تھے
اُن کو اس روزگار میں دیکھا

دمِ صبح بزم خوش جہاں، شبِ غم سے کم نہ تھے مہرباں
کہ چراغ تھا سو تو دُود تھا، جو پتنگ تھا سو غبار تھا
دلِ خستہ جو لہو ہو گیا، تو بھلا ہوا کہ کہاں تلک
کبھو سوزِ سینہ سے داغ تھا، کبھو دردِ غم سے فگار تھا

دلِ مضطرب سے گزر گئی، شبِ وصل اپنی ہی فکر میں
نہ دماغ تھا نہ فراغ تھا، نہ شکیب تھا نہ قرار تھا

جو نگاہ کی بھی پلک اُٹھا، تو ہمارے دل سے لہو بہا
کہ وہیں وہ ناوکِ بے خطا، کسو کے کلیجے کے پار تھا

یہ تمھاری ان دنوں دوستاں، مژہ جس کے غم میں ہے خوں چکاں
وہی آفتِ دلِ عاشقاں، کسو وقت ہم سے بھی یار تھا

نہیں تازہ دل کی شکستگی، یہی درد تھا یہی خستگی
اُسے جب سے ذوقِ شکار تھا، اُسے زخم سے سروکار تھا

کبھو جائے گی جو اُدھر صبا، تو یہ کہیو اس سے کہ بے وفا
مگر ایک میرِ شکستہ پا، ترے باغِ تازہ میں خار تھا

مہر کی تجھ سے توقع تھی ستم گر نکلا — موم سمجھے تھے ترے دل کو سو پتھر نکلا
دل کی آبادی کی اس حد ہے خرابی کہ نہ پوچھ — جانا جاتا ہے کہ اس راہ سے لشکر نکلا
اشکِ تر، قطرۂ خوں، لختِ جگر، پارۂ دل — ایک سے ایک عدد آنکھ سے بہ کر نکلا

ہم نے جانا تھا لکھے گا تو کوئی حرف اے میر
پر ترا نامہ تو اک شوق کا دفتر نکلا

ہم کشتگانِ عشق ہیں ابرو و چشمِ یار! — سر سے ہمارے تیغ کا سایا نہ جائے گا
پھوڑا سا ساری رات جو پکتا رہے گا دل — تو صبح تک تو ہاتھ لگایا نہ جائے گا

اب دیکھ لے کہ سینہ بھی تازہ ہوا ہے چاک — پھر ہم سے اپنا حال دکھایا نہ جائے گا
گو بیستوں کو ٹال دے آگے سے کوہکن — سنگِ گرانِ عشق اٹھایا نہ جائے گا
یاد اُس کی اتنی خوب نہیں میرؔ باز آ
نادان پھر وہ جی سے بھلایا نہ جائے گا

دنیا کی نہ کر تو خواستگاری — اس سے کبھو بہرہ ور نہ ہوگا
آخانہ خرابی اپنی مت کر — قحبہ ہے یہ اس سے گھر نہ ہوگا
پھر نوحہ گری کہاں جہاں میں
ماتم زدہ میرؔ اگر نہ ہوگا

مت رنجہ کر کسی کو کہ اپنے تو اعتقاد — دل ڈھائے کر جو کعبہ بنایا تو کیا ہوا
میں صیدِ ناتواں بھی تجھے کیا کروں گا یاد — ظالم اِک اور تیر لگایا تو کیا ہوا
کیا کیا دعائیں مانگی ہیں خلوت میں شیخ یوں — ظاہر جہاں سے ہاتھ اُٹھایا تو کیا ہوا
وہ فکر کر کہ چاکِ جگر پاوے التیام — ناصح جو تو نے جامہ سلایا تو کیا ہوا
جیتے تو میرؔ اُن نے مجھے داغ ہی رکھا
پھر گور پر چراغ جلایا تو کیا ہوا

دل جو تھا اک آبلہ پھوٹا گیا — رات کو سینہ بہت کوٹا گیا
میں نہ کہتا تھا کہ منہ کر دل کی اور — اب کہاں وہ آئینہ ٹوٹا گیا

دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے　　یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا
میرؔ کس کو اب دماغِ گفتگو　　عمر گذری ریختہ چھوٹا گیا

اے دوست کوئی مجھ سا رسوا نہ ہوا ہوگا　　دشمن کے بھی دشمن پر ایسا نہ ہوا ہوگا
ٹک گورِ غریباں کی کر سیر کہ دنیا میں　　ان ظلم رسیدوں پر کیا کیا نہ ہوا ہوگا
اس کہنہ خرابے میں آبادی نہ کر منعم　　اک شہر نہیں یاں جو صحرا نہ ہوا ہوگا
آنکھوں سے تری ہم کو ہے چشم کہ اب ہووے　　جو فتنہ کہ دنیا میں برپا نہ ہوا ہوگا
جز مرتبۂ کل کو حاصل کرے ہے آخر　　اک قطرہ نہ دیکھا جو دریا نہ ہوا ہوگا

حق ڈھونڈھنے کا آپ کو آتا نہیں ورنہ　　عالم ہے سبھی یار کہاں یار نہ پایا
مربوط ہیں تجھ سے بھی یہی ناکس و نااہل　　اس باغ میں ہم نے گلِ بے خار نہ پایا

خواہ مجھ سے لڑ گیا اب خواہ مجھ سے مل گیا　　کیا کہوں اے ہمنشیں میں تجھ سے حاصل دل گیا
اپنے ہی دل کو نہ ہو واشد تو کیا حاصل نسیم　　گو چمن میں غنچۂ پژمردہ تجھ سے کھل گیا
دل سے آنکھوں میں لہو آتا ہے شاید رات کو　　کشمکش میں بیقراری کی یہ پھوڑا چھل گیا
رشک کی جاگہ ہے مرگ اس کشتۂ حسرت کی میرؔ　　نعش کے ہمراہ جس کی گور تک قاتل گیا

تا بمقدور انتظار کیا　　دل نے اب زور بے قرار کیا
دشمنی ہم سے کی زمانے نے　　کہ جفاکار تجھ سا یار کیا

یہ توہّم کا کارخانہ ہے　　یاں وہی ہے جو اعتبار کیا
صد رگِ جاں کو تاب دے باہم　　تیری زلفوں کا ایک تار کیا
ہم فقیروں سے بے ادائی کیا　　آن بیٹھے جو تم نے پیار کیا
سخت کافر تھا جن نے پہلے میرؔ　　مذہبِ عشق اختیار کیا

دل و دماغ ہے اب کس کو زندگانی کا　　جو کوئی دم ہے تو افسوس ہے جوانی کا
نمود کر کے وہیں بحرِ غم میں بیٹھ گیا　　کہے تو میرؔ بھی اک بلبلا تھا پانی کا

کبھو نہ آنکھوں میں آیا وہ شوخ خواب کی طرح　　تمام عمر ہمیں اُس کا انتظار رہا
بہا تو خون ہو آنکھوں کی راہ بہہ نکلا　　رہا جو سینۂ سوزاں میں داغ دار رہا
سو اُس کو ہم سے فراموش کاریاں لے گئے　　کہ اُس سے قطرۂ خوں بھی نہ یادگار رہا
گلی میں اس کی گیا، سو گیا، نہ بولا پھر　　میں میرؔ میرؔ کر اس کو بہت پکار رہا

جیتے جی کوچۂ دلدار سے جایا نہ گیا　　اُس کی دیوار کا سر سے مرے سایا نہ گیا
زیرِ شمشیرِ ستم میرؔ تڑپنا کیسا!　　سر بھی تسلیمِ محبت میں ہلایا نہ گیا

جی میں آتا ہے کہ کچھ اور بھی موزوں کیجے　　دردِ دل ایک غزل میں تو سنایا نہ گیا
میر تو تھا صیدِ زبوں صید گہِ عشق کے بیچ　　آپ کو خاک میں بھی خوب ملایا نہ گیا
شہرِ دل آہ عجب جائے تھی پر اُس کے گئے　　ایسا اُجڑا کہ کسی طرح بسایا نہ گیا

گریباں سے رہا کوتہ تو پھر ہے — ہمارے ہاتھ میں دامن ہمارا
گئے جوں شمع اُس مجلس میں جلنے — سبھوں پر حال ہے روشن ہمارا
کیا تھا ریختہ پردہ سخن کا — سو ٹھہرا ہے یہی اب فن ہمارا

گلیوں میں اب تلک تو مذکور ہے ہمارا — افسانۂ محبت مشہور ہے ہمارا
مقصود کو تو دیکھیں کبتک پہنچتے ہیں ہم — بالفعل اب ارادہ تاگور ہے ہمارا
بے طاقتی کریں تو تم بھی معاف رکھیو — کیا کیجیے کہ دل بھی مجبور ہے ہمارا
ہیں مشتِ خاک لیکن جو کچھ ہیں میرؔ ہم ہیں — مقدور سے زیادہ مقدور ہے ہمارا

جہاں پُر ہے فسانے سے ہمارے — دماغِ عشق ہم کو بھی کبھو تھا
نہ دیکھا میرؔ آوارہ کو لیکن — غبار اک ناتواں سا کو بکو تھا

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا — آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا
قافلے میں صبح کے اِک شور ہے — یعنی غافل ہم چلے سوتا ہے کیا
غیرتِ یوسف ہے یہ وقتِ عزیز — میرؔ اس کو رائیگاں کھوتا ہے کیا

آنکھوں نے رازداری محبت کی خوب کی — آنسو جو آتے آتے رہے تو لہو بہا
کس کس طرح سے میرؔ نے کاٹا ہے عمر کو — اب آخر آخر آن کے یہ ریختہ کہا

کچھ نہ دیکھا پھر بجز اک شعلۂ پُرپیچ و تاب
شمع تک تو ہم نے دیکھا تھا کہ پروانا گیا

ایک ہی چشمک تھی فرصتِ صحبتِ احباب کی
دیدۂ تر ساتھ لے مجلس سے پیمانا گیا

دُور تجھ سے میر نے ایسا تعب کھینچا کہ شوخ
کل جو میں دیکھا اُسے مطلق نہ پہچانا گیا

اشک آنکھوں میں کب نہیں آتا
لہو آتا ہے جب نہیں آتا

ہوش جاتا نہیں رہا لیکن
جب وُہ آتا ہے تب نہیں آتا

صبر تھا ایک مُونسِ ہجراں
سو وہ مدّت سے اب نہیں آتا

دل سے رخصت ہوئی کوئی خواہش
گریہ کچھ بے سبب نہیں آتا

عشق کو حوصلہ ہے شرط ورنہ
بات کا کس کو ڈھب نہیں آتا

دُور بیٹھا غبارِ میر اس سے
عشق بن یہ ادب نہیں آتا

نہ وے زنجیر کے غل ہیں نہ وے جرگے غزالوں کے
مرے دیوانے پن تک ہی رہا معمور ویرانا

نہو کیوں ریختہ بے شورش و کیفیت و معنیٰ
گیا ہو میر دیوانہ رہا سودا سو مستانا

سب پہ جس بار نے گرانی کی
اُس کو یہ ناتواں اُٹھا لایا

دِل مجھے اُس گلی میں لے جا کر
اور بھی خاک میں مِلا لایا

ابتدا ہی میں مر گئے سب یار
عشق کی کون انتہا لایا

اب تو جاتے ہیں بُتکدے سے میرؔ   پھر ملیں گے اگر خُدا لایا

جُوں برگ ہائے لالہ پریشان ہو گیا   مذکور کیا ہے اب جگرِ لخت لخت کا
دِلّی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں اُنھیں   تھا کل تلک دماغ جنھیں تاج و تخت کا
خاکِ سیہ سے میں جو برابر ہوا ہوں میرؔ   سایہ پڑا ہے مجھ پہ کسو تیرہ بخت کا

ہے حال جائے گریہ جانِ پُر آرزو کا   روئے نہ ہم کبھو ٹک دامن پکڑ کسو کا
بُلبل غزل سرائی آگے ہمارے مت کر   سب ہم سے سیکھتے ہیں انداز گفتگو کا

پیغامِ غم جگر کا گلزار تک نہ پہنچا   نالہ مرا چمن کی دیوار تک نہ پہنچا
یوسف سے لے کے تا گُل پھر گُل سے لے کے تا شمع
یہ حُسن کس کو لے کر بازار تک نہ پہنچا

غم رہا جب تک کہ دم میں دم رہا   دم کے جانے کا نہایت غم رہا
دل نہ پہنچا گوشۂ داماں تلک   قطرۂ خوں تھا مژہ پر جم رہا

دل جو زیرِ غبار اکثر تھا   کچھ مزاج ان دنوں مکدّر تھا
سرسری تم جہان سے گزرے   ورنہ ہر جا جہانِ دیگر تھا
دل کی کچھ قدر کرتے رہیو تم   یہ ہمارا بھی ناز پرور تھا

اب خرابہ ہوا جہاں آباد　　ورنہ ہر اک قدم پہ یاں گھر تھا
بے زری کا نہ کر گلہ غافل　　رہ تسلّی کہ یوں مقدر تھا
خوش رہا جب تلک رہا جیتا　　میرؔ معلوم ہے قلندر تھا

آدم خاکی سے عالم کو جلا ہے ورنہ　　آئینہ تھا یہ ولے قابلِ دیدار نہ تھا
دھوپ میں جلتی ہیں غربت وطنوں کی لاشیں　　تیرے کوچے میں مگر سایۂ دیوار نہ تھا

کل چمن میں گل و سمن دیکھا　　آج دیکھا تو باغ بن دیکھا
حسرت اس کی جگہ تھی خوابیدہ　　میرؔ کا کھول کر کفن دیکھا

جہاں کو فتنے سے خالی کبھو نہیں پایا　　ہمارے وقت میں تو آفتِ زمانہ ہوا
کھلا نشے میں جو پگڑی کا پیچ اُس کی میرؔ　　سمندِ ناز پہ ایک اور تازیانہ ہوا

قاصد جو واں سے آیا تو شرمندہ میں ہوا　　بیچارہ گریہ ناک گریباں دریدہ تھا
دلِ بے قرار گریۂ خونیں تھا رات میرؔ　　آیا نظر تو بسمل درخوں طپیدہ تھا

برگشتہ بخت دیکھ کہ قاصد سفر سے میں　　بھیجا تھا اس کے پاس سو میرے وطن گیا
آئی اگر بہار تو اب ہم کو کیا صبا!　　ہم سے تو آشیاں بھی گیا اور چمن گیا
سرسبز ملکِ ہند میں ایسا ہوا کہ میرؔ　　یہ ریختہ لکھا ہوا تیرا دکن گیا

دامن میں آج دیکھا پھر لخت میں نے آیا ٹکڑا کوئی جگر کا پلکوں میں رہ گیا تھا
یہ سرگزشت میری افسانہ جو ہوئی ہے مذکور اس کا اُس کے کوچے میں جابجا تھا
کہنے لگا کہ جانے میری بلا عزیزاں احوال تھا کسی کا کچھ میں بھی سُن لیا تھا

آنکھوں میں جی مرا ہے اِدھر یار دیکھنا عاشق کا اپنے آخری دیدار دیکھنا
کیسا چمن کہ ہم سے اسیروں کو منع ہے چاکِ قفس سے باغ کی دیوار دیکھنا
گر زمزمہ یہی ہے کوئی دِن تو ہم صفیر! اس فصل ہی میں ہم کو گرفتار دیکھنا

جو اِس شور سے میؔر روتا رہے گا تو ہمسایہ کاہے کو سُوتا رہے گا
بس اے میؔر مژگاں سے پونچھ آنسوؤں کو تو کب تک یہ مُوتی پروتا رہے گا

دِل عشق کا ہمیشہ حریفِ نبرد تھا اب جس جگہ کہ داغ ہے یاں آگے درد تھا
مانندِ حرف صفحۂ ہستی سے اُٹھ گیا دِل بھی مرا جریدۂ عالم میں فرد تھا
عاشق ہیں ہم تو میؔر کے بھی ضبطِ عشق کے دِل جل گیا تھا اور نفس لب پہ سرد تھا

خوبی کو اس کے چہرے کی کیا پہنچے آفتاب ہے اِس میں اُس میں فرق زمین آسمان کا
یاں بُلبل اور گل پہ تو عبرت سے آنکھ کھول گُلگشت سرسری نہیں اِس گلستان کا
تو برسوں میں کہے ہے ملوں گا میں میؔر سے یاں کچھ کا کچھ ہے حال ابھی اُس جوان کا

داد دے ورنہ ابھی جان بہ کھیلو گی میں — دِل جلانا نہیں دیکھا کسی فریادی کا
ریختہ رُتبے کو پہنچایا ہوا اس کا ہے — معتقد کون نہیں میرؔ کی اُستادی کا

بیٹھا ہوں جُوں غبارِ ضعیف اب دگر نہ میں — پھرتا رہا ہوں گلیوں میں آوارہ گرد سا
قصدِ طریقِ عشق کیا سب نے بعدِ قیس — لیکن ہوا نہ ایک بھی اس رہ نورد سا
کیا میرؔ ہے یہی جو ترے در پہ تھا کھڑا — نمناک چشم و خشک لب و رنگ زرد سا

بتاؤ ہم سے کوئی آن تم سے کیا بگڑی — نہیں ہے تم کو سلیقہ زمانہ سازی کا
خدا کو کام تو سونپے ہیں میں نے سب لیکن — رہے ہے خوف مجھے واں کی بے نیازی کا
بسانِ خاک ہو پامالِ راہِ خلق اے میرؔ — رکھے ہے دل میں اگر قصد سرفرازی کا

جلوہ ہے اسی کا سب گلشن میں زمانے کے — گل پھول کو ہے اُن نے پردہ سا بنا رکھا
خورشید و قمر پیارے رہتے ہیں چھپے کوئی — رُخساروں کو گو تو نے برقع سے چھپا رکھا

سب گئے ہوش و صبر و تاب و تواں — دل سے اِک داغ ہی جُدا نہ ہوا
ظلم و جور و جفا ستم بیداد — عشق میں تیرے ہم پہ کیا نہ ہوا
ہم تو ناکام ہی جہاں میں رہے — یاں کبھو اپنا مُدّعا نہ ہوا

آہ سحر نے سوزشِ دل کو مٹا دیا — اِس باد نے ہمیں تو دیا سا بجھا دیا

کبھی نہ باد صبح کہ آکر اُٹھا دیا — اس فتنۂ زمانہ کو ناحق جگا دیا

آوارگانِ عشق کا پوچھا جو میں نشاں — مشتِ غبار لے کے صبا نے اُڑا دیا

تکلیف دردِ دل کی عبث ہمنشیں نے لی — دردِ سخن نے میرے سبھوں کو رُلا دیا

ب

یہ اتّصال اشکِ جگر سوز کا کہاں — روتی ہے یوں تو شمع بھی کم کم تمام شب

شکوہ عبث ہے میرؔ کہ کڑھتے ہیں سارے دن — یا دل کا حال رہتا ہے درہم تمام شب

گُزرا کیے جہاں میں خوشی سے تمام روز — کس کی کٹی زمانے میں بے غم تمام شب

کس کی مسجد، کیسے بُت خانے کہاں کے شیخ و شاب
ایک گردش میں تری چشمِ سیہ کے سب خراب

مت ڈھلک مژگاں سے اب تو اے سرشکِ آب دار
مُفت ہی جاتی رہے گی تیری موتی کی سی آب

کچھ نہیں بحرِ جہاں کی موج پر مت بھول میرؔ
دُور سے دریا نظر آتا ہے لیکن ہے سراب

دیکھ خورشید تجھ کو اے محبوب! — عرقِ شرم میں گیا ہے ڈوب

آئی کنعاں سے بادِ مصر ولے — نہ گئی تا بہ کلبۂ یعقوبؑ

اس لئے عشق میں نے چھوڑا تھا — تو بھی کہنے لگا بُرا کیا خوب

میرؔ شاعر بھی زور کوئی تھا — دیکھتے ہو نہ بات کا اسلوب؟

ت

دُوری میں کروں نالہ و فریاد کہاں تک — اک بار تو اُس شوخ سے یارب ہو ملاقات
جاتی ہے غشی بھی کبھو آتے ہیں بخود بھی — کچھ لطف اُٹھے بارے اگر اب ہو ملاقات
وحشت ہے بہت میرؔ کو مِل آئیے چل کر — کیا جانیے پھر یاں سے گئے کب ہو ملاقات

قیس و فرہاد اور وامق عاقبت جی سے گئے
سب کو مارا عشق نے مجھ خانماں ویراں سمیت
اُڑ گیا پردہ نصیحت گر کے لگ پڑنے سے میرؔ
پھاڑ ڈالا میں گریباں رات کو داماں سمیت

جاگے تھے ہمارے بختِ خُفتہ — پہنچا تھا بہم وہ اپنے گھر رات
تھی صُبح جو منہ کو کھول دیتا — ہر چند کہ تب تھی اِک پہر رات
پر زُلفوں میں مُنہ چھپا کے پوچھا — اب ہووے گی میرؔ کس قدر رات

چُھٹتا ہی نہیں ہو جسے آزارِ محبت — مایوس ہوں میں بھی کہ ہوں بیمارِ محبت
ہر جنس کے خواہاں ملے بازارِ جہاں میں — لیکن نہ مِلا کوئی خریدارِ محبت
مجھ سا ہی ہو مجنوں بھی یہ کب مانے ہے عاقل — ہر سَر نہیں اے میرؔ سزاوارِ محبت

دل خراشی و جگر چاکی و خوں افشانی — ہوں تو ناکام پہ رہتے ہیں مجھے کام بہت

پھر نہ آئے جو ہوئے خاک میں جا آسودہ
غالباً زیرِ زمیں میرؔ ہے آرام بہت

اب تو چپ لگ گئی ہے حیرت سے
پھر کھلے گی زبان جب کی بات

نکتہ دانانِ رفتہ کی نہ کہو
بات وہ ہے جو ہوئے اب کی بات

کس کا روئے سخن نہیں ہے ادھر
ہے نظر میں ہمارے سب کی بات

چ

ہیں عناصر کی یہ صورت بازیاں
شعبدے کیا کیا ہیں ان چاروں کے بیچ

عاشقی و بے کسی و رفتگی
جی رہا کب ایسے آزاروں کے بیچ

چشمِ بد دور کہ کچھ رنگ ہے اب گریہ پر
خون جھمکے ہے پڑا دیدۂ گریان کے بیچ

حال گلزارِ زمانہ کا ہے جیسے کہ شفق
رنگ کچھ اور ہی ہو جائے ہے اک آن کے بیچ

تاک کی چھاؤں میں جوں مست پڑے سوتی ہیں
اینڈتی ہیں نگہیں سایۂ مژگان کے بیچ

دعویِ خوش دہنی اس سے رہے منہ پر گل
سر تو ٹک ڈال کے دیکھ اپنے گریبان کے بیچ

کوئی تاخیر تو اک شب کی ملاقات کے بیچ
دن نہ پھر جائیں گے عشاق کے اک رات کے بیچ

حرف زن مت ہو کسی سے تو کہ اے آفتِ شہر
جلتے رہتے ہیں ہزاروں کے ہر اک بات کے بیچ

زندگی کس کے بھروسے پہ محبت میں کرے
ایک دل غمزدہ ہے سو بھی ہے آفات کے بیچ

ح

میں اور قیس و کوہ کن اب جو زباں پہ ہیں — مارے گئے ہیں سب گنہ گار ایک طرح
سب طرحیں اُس کی اپنی نظر میں تھیں کیا کہیں — پر ہم بھی ہو گئے ہیں گرفتار ایک طرح
نیرنگِ حسن دوست سے کر آنکھیں آشنا — ممکن نہیں وگرنہ ہو دیدار ایک طرح
ہر طرح تو ذلیل ہی رکھتا ہے میر کو — ہوتا ہے عاشقی میں کوئی خوار ایک طرح

د

جینا مرا تو تجھ کو غنیمت ہے نا سمجھ! — کھینچے گا کون پھر یہ ترے ناز میرے بعد
بیٹھا ہوں میر مرنے کو اپنے میں مستعد — پیدا نہ ہوں گے مجھ سے بھی جانباز میرے بعد

میرے سنگِ مزار پر فرہاد — رکھ کے تیشہ کہے ہے یا اُستاد!
فکرِ تعمیر میں نہ رہ مُنعِم — زندگانی کی کچھ بھی ہے بنیاد
خاک بھی سر پہ ڈالنے کو نہیں — کس خرابے میں ہم ہوئے آباد
یہ مروّت کہاں کی ہے اے میر! — تو ہی مجھ دل جلے کو کر ارشاد
نامرادی ہو جس پہ پروانہ — وہ جلاتا پھرے چراغِ مُراد

ر

نہ ہو ہرزہ درا اتنا خموشی اے جرس بہتر — نہیں اس قافلے میں اہلِ دل ضبطِ نفس بہتر
سدا ہو خار خارِ باغباں گل کا جہاں مانع — سمجھ اے عندلیب اس باغ سے کنجِ قفس بہتر

روزِ محشر ہے رات، ہجراں کی — ایسی ہم زندگی سے ہیں بیزار
بحثِ نالہ بھی کیجیو بلبل! — پہلے پیدا تو کر لبِ گفتار
شکر کر داغِ دل کا اے غافل! — کس کو دیتے ہیں دیدۂ بیدار
گو غزل ہو گئی قصیدہ سی — عاشقوں کا ہے طولِ حرف شعار
میرؔ صاحب زمانہ نازک ہے! — دونوں ہاتھوں سے تھامیے دستار
جی میں آوے سو کیجیو پیارے — ایک ہونا نہ درپئے آزار
حاصلِ دو جہان ہے اک حرف — ہو مری جان آگے تم مختار

غصّے سے اُٹھ چلے ہو دامن کو جھاڑ کر — جاتے رہیں گے ہم بھی گریبان پھاڑ کر
دل وہ نگر نہیں کہ پھر آباد ہو سکے — پچھتاؤ گے سنو ہو یہ بستی اُجاڑ کر

افسوس وے کہ منتظر اک عمر تک رہے — پھر مر گئے ترے تئیں اک بار دیکھ کر
دیکھیں جدھر وہ رشکِ پری پیشِ چشم ہے — حیران رہ گئے ہیں یہ اسرار دیکھ کر
جاتا ہے آسماں لیے کوچے سے یار کے — آتا ہے جی بھرا در و دیوار دیکھ کر
تیرے خرامِ ناز پہ جاتے ہیں جی چلے — رکھ ٹک قدم زمیں پہ ستمگار دیکھ کر
جی میں تھا اس سے ملیے تو کیا کیا نہ کہیے میرؔ — پر جب ملے تو رہ گئے ناچار دیکھ کر

دیکھو نہ چشمِ کم سے معمورۂ جہاں کو — بنتا ہے ایک گھر یاں سو صورتیں بگڑ کر
اپنے مزاج میں بھی ہے میرؔ ضد نہایت — پھر مر کے ہی اُٹھیں گے بیٹھیں گے ہم جو اڑ کر

ہم اپنی آنکھوں کبتک یہ رنگ عشق دیکھیں — آنے لگا ہے لوہو رخسار پر توبہ کر
رنگ شکستہ اپنا بے لطف بھی نہیں ہے — یاں کی تو صبح دیکھی اک آدھ رات رہ کر

ہم ضعیفوں کو پائمال نہ کر — دولتِ حسن پر نہ ہو مغرور
شکوۂ آبلہ ابھی سے میرؔ — ہے پیارے ہنوز دلّی دُور

دل سے میرے شکستیں ابھی ہیں — سنگ باراں ہے آبگینے پر
جورِ دلبر سے کیا ہوں آزردہ — میرؔ اس چار دن کے جینے پر

مرگ اک ماندگی کا وقفہ ہے — یعنی آگے چلیں گے دم لے کر
دل یہ کب اکتفا کرے ہے عشق — جائے گا جان بھی یہ غم لے کر

یاں جہاں میں کہ شہرِ کوراں ہے — سات پردے ہیں چشمِ بینا پر
فرصتِ عیش اپنی یوں گزری — کہ مصیبت پڑی تمنا پر
میرؔ کیا بات اس کے ہونٹوں کی — جینا دوبھر ہوا مسیحا پر

جھوٹے بھی پوچھتے نہیں ٹک حال آن کر — انجان اتنے کیوں ہوئے جاتے ہو جان کر
ناز و عتاب و خشم کہاں تک اٹھائیے — یارب! کبھو تو ہم پہ اُسے مہربان کر

ز

ہوتا نہیں ہے باب اجابت کا وا ہنوز
بسمل پڑی ہے چرخ پہ میری دعا ہنوز

بے بال و پر اسیر ہوں کنجِ قفس میں میرؔ
جاتی نہیں ہے سر سے چمن کی ہوا ہنوز

س

اے ابر تر تو اور کسی سمت کو برس
اس ملک میں ہماری ہے یہ چشم تر ہی بس

حیراں ہوں میرؔ نزع میں اب کیا کروں بھلا
احوالِ دل بہت ہے مجھے فرصت نفس

گرم ہوگا حشر کو ہنگامۂ دعویٰ بہت
کاش کے مجھ کو نہ لے جاویں مرے قاتل کے پاس

بوئے خوں آتی ہے بادِ صبح گاہی سے مجھے
نکلی ہے بے درد شاید ہو کسو گھائل کے پاس

ش

پان تو لیتا جا فقیروں کے
برگِ سبز است تحفۂ درویش

فکر کر زادِ آخرت کا بھی
میرؔ اگر تو ہے عاقبت اندیش

ف

جو دیکھو مرے شعرِ تر کی طرف
تو مائل نہ ہو پھر گہر کی طرف

محبت نے شاید کہ دی دل میں آگ
دھواں سا ہے کچھ اس نگر کی طرف

بہت رنگ ملتا ہے دیکھو کبھو
ہماری طرف سے سحر کی طرف

ٹپکتا ہے پلکوں سے خوں متصل
نہیں دیکھتے ہم جگر کی طرف

ک

تصویر کی سی شمعیں خاموش جلتے ہیں ہم
سوزِ دروں ہمارا آتا نہیں زباں تک

آنکھیں جو روتے روتے جاتی رہیں بجا ہے — انصاف کر کہ کوئی دیکھے ستم کہاں تک

بے لطف تیرے کیونکر تجھ تک پہنچ سکیں ہم — ہیں سنگ راہ اپنے کتنے یہاں سے واں تک

مانندِ طیرِ نو پر اُٹھے جہاں گئے ہم — دشوار ہی ہمارا آنا پھر آشیاں تک

تن کام میں ہمارے دیتا نہیں وہی کچھ — حاضر ہیں میرؔ ہم تو اپنی طرف سے جاں تک

گوش کو ہوش کی ٹک کھول کے سُن شورِ جہاں

سب کی آواز کے پردے میں سخن ساز ہے ایک

چاہے جس شکل سے تمثال صفت اس میں در آ

عالم آئینہ کے مانندِ در باز ہے ایک

شب کوتہ اور قصہ مری جان کا دراز — القصہ اب کہا کروں تجھ سے میں کٹ تک

باقی یہ داستان ہے اور کل کی رات ہے — گو جان میری میرؔ نہ آ پہونچے لب تک

جسے شب آگ سا دیکھا سُلگتے — اُسے پھر خاک ہی پایا سحر تک

یہی دردِ جدائی ہے جو اس شب — تو آتا ہے جگر مژگان تر تک

کہاں پھر شور و شیون جب گیا میرؔ — یہ ہنگامہ ہے اس ہی نوحہ گر تک

شاید کہ دیوے رخصتِ گلشن ہوئے قرار — میرے قفس کو لے تو چلو باغباں تلک

قیدِ قفس سے چھوٹ کے دیکھا جلا ہوا — پہنچے نہ ہوتے کاش کہ ہم آشیاں تلک

میں ترک عشق کرکے ہوا گوشہ گیر میر — ہوتا پھروں خراب جہاں میں کہاں تلک

کب دسترس ہے لعل کو تیرے سخن تلک — رسوائیاں گئی ہیں عقیقِ یمن تلک
آزادگی یہ چھوڑ قفس ہم نہ جا سکے — حسنِ سلوکِ ضعف سے صحنِ چمن تلک

ل

اللہ رے عندلیب کی آوازِ دل خراش — جی ہی نکل گیا جو کہا ان نے ہائے گل
گل چین سمجھ کے چینیو کہ گلشن میں میر کے — لختِ جگر پڑے ہیں نہیں برگ ہائے گل

گل کی جفا بھی جانی دیکھی وفائے بلبل — یک مشت پر پڑے ہیں گلشن میں جائے بلبل
کر سیر جذبِ الفت گل چیں نے کل چمن میں — توڑا تھا شاخِ گل کو نکلی صدائے بلبل
آئی بہار گلشن گل سے بھرا ہے لیکن — ہر گوشۂ چمن میں خالی ہے جائے بلبل

مشکل ہے مٹ گئے ہوئے نقشوں کی پھر نمود — جو صورتیں بگڑ گئیں ان کا نہ کر خیال
کس کو دماغِ شعر و سخن ضعف میں کہ میر — اپنا رہے ہے اب تو ہمیں بیشتر خیال

سیر کر عندلیب کا احوال — ہیں پریشاں چمن میں کچھ پر و بال
کیوں نہ دیکھوں چمن کو حسرت سے — آشیاں تھا مرا بھی یاں پر سال

مندا ہے اختلاط کا بازار آج کل — لگتا نہیں ہے دل کا خریدار آج کل

اِس مہلت دو روزہ میں خطرے ہزار ہیں اچھا ہے رہ سکو جو خبردار آج کل
غیر ان میں ہی حال کی تدبیریں نہیں ہر اک کو شہر میں ہے یہ آزار آج کل

م

رنگِ شکستہ میرا بے لطف بھی نہیں ہے ایک آدھ رات کو تو یاں بھی سحر کرو تم
ہے بیچ دار از بس راہِ وصال و ہجراں ان دو ہی منزلوں میں برسوں سفر کرو تم

گرچہ آوارہ جوں صبا ہیں ہم ایک لگ چلنے میں بلا ہیں ہم
کوئی خواہاں نہیں ہمارا میر گویا اک جنسِ ناروا ہیں ہم

ن

بے کلی بے خودی کچھ آج نہیں ایک مدت سے وہ مزاج نہیں
درد اگر یہ ہے تو مجھے بس ہے اب دوا کی بھی احتیاج نہیں
ہم نے اپنی سی کی بہت لیکن مرضِ عشق کا علاج نہیں
شہرِ خوبی کو خوب دیکھا میر جنسِ دل کا کہیں رواج نہیں

سوزشِ دل سے مفت گلتے ہیں داغ جیسے چراغ جلتے ہیں
اِس طرح دِل گیا کہ اب تک ہم بیٹھے روتے ہیں ہاتھ ملتے ہیں
میر صاحب کو دیکھیے جو بنے اب بہت گھر سے کم نکلتے ہیں

آ نکلتے تھے جو حضرت میر اس طرف کہیں میں نے کیا سوال یہ اُن کی جناب میں

حضرت سنو تو میں بھی تعلق کروں کہیں
فرمانے لاگے رو کے یہ اس کے جواب میں

تو جان یاک تجھ سے بھی آئے جو کل تھے یاں
ہیں آج صرفِ خاک جہانِ خراب میں

نہ گیا خیالِ زلفِ سیہ جفا شعاراں
نہ ہوا کہ صبح ہووے شبِ تیرہ روزگاراں

ہوئی عید سب نے پہنے طرب و خوشی کے جامے
نہ ہوا کہ ہم بھی بدلیں یہ لباسِ سوگواراں

کہیں خاکِ کو کو اسکی تو صبا نہ دیجو جنبش
کہ بھرے ہیں اس زمیں میں جگر جگر فگاراں

رکھے تاجِ زر کو سر پر چمنِ زمانہ میں گل
نہ شگفتہ ہو تو اتنا کہ خزاں ہے یہ بہاراں

نہیں تجھ کو چشمِ عبرت یہ نمود میں ہے ورنہ
کہ گئے ہیں خاک میں مل کئی تجھ سے تاجداراں

تو جہاں سے دل اٹھا یاں نہیں رسمِ دردمندی
کسی نے بھی یوں نہ پوچھا ہوئے خاک یاں ہزاراں

یہ سُنا تھا میرؔ ہم نے کہ فسانہ خواب لاوے
تری سرگزشت سُن کر گئے اور خوابِ یاراں

اس کے کوچے میں نہ کر شورِ قیامت کا ذکر
شیخ یاں ایسے تو ہنگامے ہوا کرتے ہیں

رخصتِ جنبشِ لبِ عشق کی حیرت سے نہیں
مدتیں گزریں کہ ہم چُپ ہی رہا کرتے ہیں

فرصتِ خواب نہیں ذکرِ بتاں میں ہم کو
رات دن رام کہانی سی کہا کرتے ہیں

یہ زمانہ نہیں ایسا کہ کوئی زیست کرے
چاہتے ہیں جو بُرا اپنا بھلا کرتے ہیں

کیا کہیں میرؔ جی ہم تم سے معاش اپنی غرض
غم کو کھایا کریں ہیں لوہو پیا کرتے ہیں

سہل اس قدر نہیں ہے مشکل پسندی میری
جو تجھ کو دیکھتے ہیں مجھ کو سراہتے ہیں

وے دن گئے کہ راتیں نالوں سے کاٹتے تھے
بے ڈول میر صاحب اب کچھ کراہتے ہیں

تمھیں بھی چاہیے ہے کچھ تو پاس چاہت کا — ہم اپنی اُور سے یوں کب تلک نباہ کریں
جو اُس کی اُور کو جانا ملے تو ہم بھی ضعیف — ہزار سجدے ہر اک گام سر بہ راہ کریں

تُربت سے عاشقوں کے نہ اُٹھا کبھو غبار — جی سے گئے و لے نہ گئیں رازداریاں
اب کس کس اپنی خواہشِ مردہ کو روئیے — تھی ہم کو اس سے سیکڑوں اُمیدواریاں
پڑھتے پھریں گے گلیوں میں ان ریختوں کو لوگ — مُدت رہیں گی یاد یہ باتیں ہماریاں
کیا جانتے تھے ایسے دِن آجائیں گے شتاب — روتے گزرتیاں ہیں ہمیں راتیں ساریاں
بچ جاتا ایک رات جو کٹ جاتی اور میر — کاٹیں تھیں کوہ کن نے بہت راتیں بھاریاں

جاتا ہے اک ہجومِ غمِ عشق جی کے ساتھ — ہنگامہ لے چلے ہیں ہم اُس بھی جہان میں
یارب کوئی تو واسطہ سرگشتگی کا ہے — اک عشق بھر رہا ہے تمام آسمان میں
پھاڑا ہزار جا سے گریبانِ صبر میر — کیا کہہ گئی نسیمِ سحر گل کے کان میں

زباں رکھ غنچہ ساں اپنے دہن میں — بندھی مُٹھی چلا جا اِس چمن میں
خرد مندی ہوئی زنجیر ورنہ — گزرتی خوب تھی دیوانہ پن میں
کہاں عاجز سخن قادر سُخن ہوں — ہمیں ہے شُبہ یاروں کے سخن میں

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں — تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں
ان آئینہ رویوں کے کیا میر بھی عاشق ہیں — جب گھر سے نکلتے ہیں حیران نکلتے ہیں

کوئی نہیں جہاں میں جو اندوہگیں نہیں
اس غمکدے میں آہ! دل خوش کہیں نہیں

فکر بلند سے میں کیا آسماں اسے
ہر اک سے میر خوب ہو یہ وہ زمیں نہیں

دعوے کو یار آگے معیوب کر چکے ہیں
اس ریختے کو ورنہ ہم خوب کر چکے ہیں

حسنِ کلام کھینچے کیوں کر نہ دامنِ دل
اس کام کو ہم آخر محبوب کر چکے ہیں

ہم آپ ہی کو اپنا مقصود جانتے ہیں
اپنے سوائے کس کو موجود جانتے ہیں

عجز و نیاز اپنا اپنی طرف ہے سارا
اس مشتِ خاک کو ہم مسجود جانتے ہیں

صورت پذیر ہم بن ہرگز نہیں وہ یعنی
اہلِ نظر ہمیں کو معبود جانتے ہیں

اپنی ہی سیر کرنے ہم جلوہ گر ہوئے تھے
اس رمز کو ولیکن معدود جانتے ہیں

مر کر بھی ہاتھ آوے تو میر مفت ہے وہ!
جی کے زیان کو بھی ہم سود جانتے ہیں

کچھ کچھ کہوں گا روز یہ کہتا تھا دل میں میں
آشفتہ طبع میر کو پایا اگر کہیں

سو کل ملا مجھے وہ بیاباں کی سمت کو
جاتا تھا اضطراب زدہ سا ادھر کہیں

لگ چل کے میں برنگِ صبا یہ اسے کہا
اے خانماں خراب ترا بھی ہے گھر کہیں

آشفتہ جو جابجا پھرے ہے تو دشت میں
جاگہ نہیں ہے شہر میں تجھ کو مگر کہیں

موتی سے تیرے اشک ہیں غلطاں کسو طرف
یاقوت کے سے ٹکڑے ہیں لختِ جگر کہیں

تا کے یہ دشت گردی و کب تک یہ خستگی
اس زندگی سے کچھ تجھے حاصل بھی مر کہیں

کہنے لگا وہ ہو کے پُر آشفتہ یک بیک
مسکن کرے ہے دہر میں مجھ سا بشر کہیں

آوارگوں کو ننگ ہے سُننا نصیحتیں　　مت کہیو ایسی بات تو بارِ دگر کہیں
تعیّن جا کو بھول گیا ہوں پہ یہ ہے یاد　　کہتا تھا ایک روز یہ اہلِ نظر کہیں
کتنے ہی آئے ہے کے سر پہ خیالِ میر　　ایسے گئے کہ کچھ نہیں اُن کا اثر کہیں

مانندِ شمع ہم نے حضور اپنے یار کے　　کارِ وفا تمام کیا ایک آہ میں
پہنچے نہیں کہیں کہ نہیں واں سے اُٹھ چلے　　القصّہ ایک عمر سے ہم ہیں گے راہ میں
بیٹھے تھے میر یار کے دیدار کو سو ہم　　اپنا یہ حال کر کے اُٹھے اک نگاہ میں

نہ تنگ کر اِسے اَے فکرِ روزگار کہ مَیں　　دل اس سے دَم کے لئے مستعار لایا ہوں
چلا نہ اُٹھ کے وہیں چپکے چپکے پھر تو میر　　ابھی تو اس کی گلی سے پکار لایا ہوں

جفائیں دیکھ لیاں بے وفائیاں دیکھیں　　بھلا ہوا کہ تری سب برائیاں دیکھیں
ہمیشہ مائلِ آئینہ ہی تجھے پایا　　جو دیکھیں ہم نے یہی خود نمائیاں دیکھیں
شہاں کہ کحلِ جواہر تھی خاکِ پا جن کی　　اُنھیں کی آنکھوں میں پھرتے سلائیاں دیکھیں

تیرے جو حسن و جمال رکھتے ہیں　　سارے تیرا خیال رکھتے ہیں
خاکِ آدم ہی ہے تمام زمیں　　پاؤں کو ہم سنبھال رکھتے ہیں
اہلِ دل چشم سب تری جانب　　آئینے کی مثال رکھتے ہیں
گفتگو ناقصوں سے ہے ورنہ　　میر جی بھی کمال رکھتے ہیں

میں کون ہوں اے ہم نفساں! سوختہ جاں ہوں — اک آگ مرے دل میں ہے جو شعلہ فشاں ہوں
لایا ہے مرا شوق مجھے پردے سے باہر — میں ورنہ وہی خلوتیِ رازِ نہاں ہوں
جلوہ ہے مجھی سے لبِ دریائے سخن پہ — صد رنگ مری موج ہے میں طبعِ رواں ہوں
دیکھا ہے مجھے جن نے سو دیوانہ ہے میرا — میں باعثِ آشفتگیِ طبعِ جہاں ہوں
تکلیف نہ کر آہ مجھے جنبشِ لب کی — میں صد سخن آغشتہ بہ خوں زیرِ زباں ہوں
ہوں زرد غمِ تازہ نہالانِ چمن سے — اس باغ خزاں دیدہ میں میں برگِ خزاں ہوں
رکھتی ہے مجھے خواہشِ دل بسکہ پریشاں — درپے نہ ہو اس وقت خدا جانے کہاں ہوں
اک وہم نہیں بیش مری ہستیِ موہوم — اس پر بھی تری خاطرِ نازک پہ گراں ہوں

کھو دیں ہیں نیند میری مصیبت بیانیاں — تم بھی تو ایک رات سنو یہ کہانیاں
تلوار کے تلے ہی گیا عہدِ انبساط — مر مر کے ہم نے کاٹی ہیں اپنی جوانیاں
یہ بے قراریاں نہ کبھو اُن نے دیکھیاں — جاں کاہیاں ہماری بہت سہل جانیاں

ایک دم پر ہے بنا تیری سو آیا کہ نہیں — وہ کچھ اس زندگی میں کر کہ تجھے یاد کریں
ریختہ خوب ہی کہتا ہے جو انصاف کریں — چاہیئے اہلِ سخن میر کو استاد کریں

ملنے لگے ہو دیر دیر دیکھیے کیا ہے کیا نہیں — تُم تو کرو ہو صاحبی بندے میں کچھ رہا نہیں
ایک فقط ہے سادگی تس پہ بلائے جاں ہے تو — عشوہ کرشمہ کچھ نہیں آن نہیں ادا نہیں
نازِ بتاں اُٹھا چکا دیر کو میر ترک کر! — کعبے میں جا کے رہ میاں! تیرے مگر خدا نہیں

یک لحظہ سینہ کوبی سے فرصت ہمیں نہیں
یعنی کہ دل کے جانے کا ماتم بہت ہی یاں

میرے ہلاک کرنے کا غم ہی عبث تمہیں!
تم شاد زندگانی کرو غم بہت ہی یاں

شاید کہ کام صبح تک اپنا کھنچے نہ میر
احوال آج شام سے درہم بہت ہی یاں

یاں ہی حیران و خفا جوں غنچۂ تصویر ہوں
عمر گزری پر نہ جانا میں کہ کیوں دلگیر ہوں

اتنی باتیں مت بنا مجھ شیفتہ سے ناصحا!
پند کے لائق نہیں میں قابلِ زنجیر ہوں

نے فلک پر راہ مجھ کو نے زمیں پر رو مجھے
ایسے کس محروم کا میں شورِ بے تاثیر ہوں

کھول کر دیوان میرا دیکھ قدرت مدعی
گرچہ ہوں میں نوجواں پر شاعروں کا پیر ہوں

اس قدر بے ننگ خبطوں کو نصیحت شیخ جی!
باز آؤ ورنہ اپنے نام کا میں میر ہوں

کہے ہے کوہ کن کر فکر میری خستہ حالی میں
الٰہی شکر کرتا ہوں تری درگاہ عالی میں

مرے اُستاد کو فردوسِ اعلیٰ میں ملے جاگہ
پڑھایا کچھ نہ غیر از عشق مجھ کو خرد سالی میں

خلاف ان اور خوباں کے سدا یہ جی میں رہتا ہی
یہی تو میر اک خوبی ہی معشوقِ خیالی میں

رندِ مفلس جگر میں آہ نہیں
جانِ محزوں ہی اور کیا ہی یاں

کیسے کیسے مکان ہیں ستھرے
ایک از آں جملہ کربلا ہی یاں

اک سسکتا ہے ایک مرتا ہے
ہر طرف ظلم ہو رہا ہی یاں

صد تمنا شہید ہیں یک جا
سینہ کوبی ہے تعزیا ہی یاں

موت مجنوں کو بھی یہیں آئی
کوہ کن کل ہی مر گیا ہی یاں

جہاں اب خار زاریں ہو گئی ہیں
یہیں آگے بہاریں ہو گئی ہیں

جنوں میں خشک ہو رگ ہائے گردن
گریباں کی سی تاریں ہو گئی ہیں

خوش نہ آئی تمہاری چال ہمیں
یوں نہ کرنا تھا پائمال ہمیں

حال کیا پوچھ پوچھ جاتے ہو
کبھو پاتے بھی ہو بحال ہمیں

وجہ کیا ہے کہ میرؔ منہ پر ترے
نظر آتا ہے کچھ ملال ہمیں

نہ کیونکہ شیخ توکل کو اختیار کریں
زمانہ ہووے مساعد تو روزگار کریں

گیا وہ زمزمۂ صبح فصلِ گل بلبل
دعا نہ پہنچے چمن تک ہم اب ہزار کریں

تسلی تو ہو دل بے قرار خوباں سے
یہ کاش ملنے نہ ملنے کا کچھ قرار کریں

آرزوئیں ہزار رکھتے ہیں
تو بھی ہم دل کو مار رکھتے ہیں

ہم سے خوش زمزمہ کہاں یوں تو
لب و لہجہ ہزار رکھتے ہیں

پھر بھی کرتے ہیں میرؔ صاحب عشق
ہیں جواں اختیار رکھتے ہیں

ایک سب آگ ایک سب پانی
دیدہ و دل عذاب ہیں دونوں

آگے دریا تھے دیدۂ تر میرؔ
اب جو دیکھو سراب ہیں دونوں

و

کہتے ہو اتحاد ہے ہم کو
ہاں کہو اعتماد ہے ہم کو

آہ کس ڈھب سے روئیے کم کم ! — شوق حد سے زیادہ ہے ہم کو
نامرادانہ زیست کرتا تھا — میر کا طور یاد ہے ہم کو

ہم دور ماندگاں کی منزل رساں گر اب — یا ہو صدا جرس کی یا گردِ کارواں ہو
کیا ہے حباب ساں یاں آ دیکھ اپنی آنکھوں — گر پیرہن میں میرے میرا تجھے گماں ہو
از خویش رفتہ ہردم رہتے ہیں ہم جو اس بن — کہتے ہیں لوگ اکثر اِس وقت تم کہاں ہو

عشق کیا کیا ہمیں دکھاتا ہے — آہ تم بھی تو اک نظر دیکھو
دل ہوا ہے طرف محبت کا — خون کے قطرے کا جگر دیکھو
پہنچے ہیں ہم قریب مرنے کے — یعنی جاتے ہیں دور، اگر دیکھو

جس راہ ہو کے آج میں پہنچا ہوں تجھ تلک — کافر کا بھی گزار الٰہی ادھر نہ ہو
یک جادہ دیکھی آنکھوں سے ایسی تمام راہ — جس میں بجائے نقشِ قدم چشم تر نہ ہو
اُٹھ جائے رسم نالہ و آہ و فغاں سب — اس تیرہ روزگار میں تو میر اگر نہ ہو

سو تہ و بالا ہوتا ہے، درہم برہم شاخِ گل
نازسے قد کش ہو کے چمن میں ایک بلا تُم لاتے ہو

صبح سے یاں پھر جان و دل پر روزِ قیامت رہتی ہے
رات کبھو آ رہتے ہو تو یہ دن ہم کو دکھلاتے ہو

چشم تو ہی اک دید کی جا، پر کب تکلیف کے لائق ہے
دل جو ہے دلچسپ مکاں تم اس میں کب کب آتے ہو
ہو کے گدائے کوئے محبت زور صدا یہ نکالی ہے
اب تو میر جی راتوں کو تم ہر در پر چلّاتے ہو

وہی جانے جو حیا کشتہ وفا رکھتا ہو
اور رسوائی کا اندیشہ جدا رکھتا ہو
آوے ہی پہلے قدم سر ہی کا جانا درپیش
دیکھتا ہو جو رہِ عشق میں پا رکھتا ہو
گل ہو، مہتاب ہو، آئینہ ہو، خورشید ہو میر
اپنا محبوب وہی ہے جو ادا رکھتا ہو

مت پوچھو کچھ اپنی باتیں کہیے تو تم کو ندامت ہو
قد قامت پر کچھ ہے تمہارا لیکن قہر قیامت ہو
چاہ کا دعویٰ سب کرتے ہیں مانیے کیونکر بے آثار
اشک کی سرخی، زردی منھ کی عشق کی کچھ تو علامت ہو
شور و شغب کو راتوں کے ہمسائے تمہارے کیا رو ویں
ایسے فتنے کتنے اٹھیں گے میر جی تم جو سلامت ہو

شیخ جی آؤ مصلّیٰ گرو جام کرو
جنسِ تقویٰ کے تئیں صرفِ مے خام کرو
اٹھ کھڑے ہو جو جھکے گردنِ مینائے شراب
خدمتِ بادہ گساراں ہی سرانجام کرو
سایۂ گل میں لبِ جو، یہ گلابی رکھو
ہاتھ میں جام کو لو آپ کو بدنام کرو

آہ تا چند رہو خانقہ و مسجد میں
ایک تو صبح گلستان میں بھی شام کرو

رات تو ساری گئی سنتے پریشاں گوئی
میر جی کوئی گھڑی تم بھی تو آرام کرو

دل صاف ہو تو جلوہ گہہ یار کیوں نہ ہو
آئینہ ہو تو قابلِ دیدار کیوں نہ ہو

آیاتِ حق ہیں سارے یہ ذرّاتِ کائنات
اِنکار تجھ کو ہووے سو اقرار کیوں نہ ہو

ہر دم کی تازہ مرگِ جدائی سے تنگ ہوں
ہونا جو کچھ ہو آہ سو یک بار کیوں نہ ہو

موئے سفید ہم کو کہے ہے کہ غافلاں
اب صبح ہونے آئی ہے بیدار کیوں نہ ہو

مجنوں جو دشت گرد تھا ہم شہر گرد ہیں
آوارگی ہماری بھی مذکور کیوں نہ ہو

خالی نہیں غزل کوئی دیوان سے مرے
افسانہ عشق کا ہے یہ مشہور کیوں نہ ہو

گزری ہے شب خیال میں خوباں کے جاگتے
آنکھیں لگا کے اُن سے میں ترسوں ہوں خواب کو

اب تو نقاب منہ پہ لے ظالم کہ شب ہوئی
شرمندہ سارے دن تو کیا آفتاب کو

کہنے سے میر اور بھی ہوتا ہے مضطرب
سمجھاؤں کب تک اس دلِ خانہ خراب کو

کیا ہے گر بدنامی و حالت تباہی بھی نہ ہو
عشق کیسا جس میں اتنی روسیاہی بھی نہ ہو

لطف کیا آزردہ ہو کر آپ سے ملنے کے بیچ
ٹک تو ہی جانب سے جب تک عذر خواہی بھی نہ ہو

چاہتا ہے جی کہ ہم تو ایک جا تنہا ملیں
ناز بے جا بھی نہ ہووے کم نگاہی بھی نہ ہو

۵

آگے تھے ابتدائے عشق میں ہم — اب جو ہیں خاک انتہا ہے یہ
ہے رہے بیگانگی کبھو اُن نے — نہ کہا یہ کہ آشنا ہے یہ
میرؔ کو کیوں نہ مغتنم جانے — اگلے لوگوں میں اِک رہا ہے یہ

اب حال اپنا اس کے ہے دل خواہ — کیا پوچھتے ہو الحمد للہ
مر جاؤ کوئی پروا نہیں ہے — کتنا ہے مغرور اللہ اللہ
پیرِ مُغاں سے بے اعتقادی — استغفر اللہ استغفر اللہ
مجرم ہوئے ہم دل دے کے ورنہ — کس کو کسو سے ہوتی نہیں چاہ
ظاہر کہ باطن اوّل کہ آخر — اللہ اللہ، اللہ اللہ

کیا کہوں تجھ سے کہ کیا دیکھا ہے تجھ میں میں نے — عشوہ و غمزہ و انداز و ادا کیا کیا کچھ
نام ہیں خستہ و آوارہ و بدنام مرے — ایک عالم نے غرض مجھ کو کہا کیا کیا کچھ
دردِ دل، زخمِ جگر، کلفتِ غم، داغِ فراق — آہ! عالم سے مرے ساتھ چلا کیا کیا کچھ
ایک محروم چلے میرؔ ہمیں عالم سے — ورنہ عالم کو زمانے نے دیا کیا کیا کچھ

رات مجلس میں تری ہم بھی کھڑے تھے چپکے — جیسے تصویر لگا دے کوئی دیوار کے ساتھ
مر گئے پر بھی کھلی رہ گئیں آنکھیں اپنی — کون اس طرح مُوا حسرتِ دیدار کے ساتھ

ی

ہے غزل میرؔ یہ شفائی کی
ہم نے بھی طبع آزمائی کی

اُس کے ایفائے عہد تک نہ جیے
عمر نے ہم سے بے وفائی کی

اسی تقریب اُس گلی میں رہے
منتیں ہیں شکستہ پائی کی

کاسۂ چشم لے کے جوں نرگس
ہم نے دیدار کی گدائی کی

کل میرؔ نے کیا کیا کی مے کے لئے بیتابی
آخر کو گرو رکھا سجّادۂ محرابی

دن رات مری چھاتی جلتی ہے محبت میں
کیا اور نہ تھی جاگہ یہ آگ جو یاں دابی

سو ملک پھرا لیکن پائی نہ وفا اک جا
جی کھا گئی ہے میرا اس جنس کی نایابی

کل میرؔ جو یاں آیا طور اس کا بہت بھایا
وہ خشک لبی تس پر جامہ گلے میں آبی

کچھ موج ہوا پیچاں اے میرؔ نظر آئی
شاید کہ بہار آئی زنجیر نظر آئی

دلّی کے نہ کوچے اوراقِ مصوّر تھے
جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی

گل بار کرے ہوگا اسبابِ سفر شاید
غنچے کی طرح بُلبل دل گیر نظر آئی

ہوگئی شہر شہر رسوائی
اے مری موت تو بھلی آئی

میرؔ جب سے گیا ہے دل تب سے
میں تو کچھ ہوگیا ہوں سودائی

کیا کروں شرحِ خستہ جانی کی
میں نے مر مر کے زندگانی کی

حالِ بدگفتنی نہیں میرا — تُم نے پوچھا تو مہربانی کی
بیت بحثی سمجھ کے کر بُلبُل — دُھوم ہے میری خوش زبانی کی

رہی نگفتہ مرے دِل میں داستاں میری — نہ اس دیار میں سمجھا کوئی زباں میری
اسی سے دُور رہا اصل مدعا جو تھا — گئی یہ عمرِ عزیز آہ رائیگاں میری
ترے فراق میں جیسے خیالِ مُفلِس کا — گئی ہے فکر پریشاں کہاں کہاں میری
دیا دکھائی مجھے تو اسی کا جلوہ میر — پڑی جہان میں جاکر نظر جہاں میری

اب کے بھی سیرِ باغ کی جی میں ہوس رہی — اپنی جگہ بہار میں کُنجِ قفس رہی
میں پا شکستہ جا نہ سکا قافلے تلک — آتی اگرچہ دیر صدائے جرس رہی
جوں صبح اس چمن میں نہ ہم کھل کے ہنس سکے — فرصت رہی جو میر بھی سو اک نفس رہی

آن میں کچھ ہیں آن میں کچھ ہیں — تحفۂ روزگار ہیں ہم بھی
منع گریہ نہ کر تو اے ناصح! — اس میں بے اختیار ہیں ہم بھی
گرزِ خود رفتہ ہیں ترے نزدیک — اپنے تو یادگار ہیں ہم بھی

غفلت میں گئی آہ مری ساری جوانی — اے عمرِ گزشتہ میں تری قدر نہ جانی
مُدت سے ہیں اک مشت پر آوارہ چمن میں — نکلی ہے یہ کس کی ہوس بال فشانی
یہ کہہ کے جو رویا تو لگا کہنے نہ کہہ میر — سُنتا نہیں میں ظلم رسیدوں کی کہانی

کوئی ہو محرم شوخی ترا تو میں پوچھوں
کہ بزم عیش جہاں کیا سمجھ کے برہم کی

ہمیں تو باغ کی تکلیف سے معاف رکھو
کہ سیر و گشت نہیں رسم اہل ماتم کی

قفس میں میرؔ نہیں جوش داغ سینے میں
ہوس نکالی ہے ہم نے بھی گل کے موسم میں

دیکھ تو دل کہ جاں سے اٹھتا ہے
یہ دھواں سا کہاں سے اٹھتا ہے

بیٹھنے کون دے ہے پھر اس کو
جو ترے آستاں سے اٹھتا ہے

یوں اٹھے آہ اس گلی سے ہم
جیسے کوئی جہاں سے اٹھتا ہے

عشق اک میرؔ بھاری پتھر ہے
کب یہ تجھ ناتواں سے اٹھتا ہے

سراپا آرزو ہونے نے بندہ کر دیا ہم کو
وگرنہ ہم خدا تھے گر دل بے مدعا ہوتے

الٰہی کیسے ہوتے ہیں جنھیں ہے بندگی خواہش
ہمیں تو شرم دامنگیر ہوتی ہے خدا ہوتے

اب ایسے ہیں کہ صانع کے مزاج اوپر بہم پہنچے
جو خاطر خواہ اپنے ہم ہوئے ہوتے تو کیا ہوتے

عشق میں نے خوف و خطر چاہیئے
جان کے دینے کو جگر چاہیئے

قابل آغوش ستم دیدگاں
اشک سا پاکیزہ گہر چاہیئے

شرط سلیقہ ہے ہر ایک امر میں
عیب بھی کرنے کو ہنر چاہیئے

ہستی اپنی حباب کی سی ہے
یہ نمائش سراب کی سی ہے

نازکی اس کے لب کی کیا کہیئے
پنکھڑی ایک گلاب کی سی ہے

بار بار اُس کے در پہ جاتا ہوں — حالت اب اضطراب کی سی ہے
میں جو بولا کہا کہ یہ آواز — اسی خانہ خراب کی سی ہے
میرؔ ان نیم باز آنکھوں میں — ساری مستی شراب کی سی ہے

اب جو اک حسرتِ جوانی ہے — عمرِ رفتہ کی یہ نشانی ہے
خاک تھی موجِ زن جہاں میں اور — ہم کو دھوکا یہ تھا کہ پانی ہے
یاں ہوئے میرؔ تم برابر خاک — واں وہی نازو سرگرانی ہے

آزردہ خاطروں سے کیا فائدہ سخن کا — تم حرف سر کروگے ہم گریہ سر کریں گے
اپنے ہی جی میں آخر انصاف کر کہ کب تک — تو یہ ستم کرے گا ہم درگذر کریں گے
صنّاعِ طرفہ ہیں ہم عالم میں ریختے کے — جو میرؔ جی لگے گا تو سب ہنر کریں گے

رنج کھینچے تھے داغ کھائے تھے — دل نے صدمے بڑے اُٹھائے تھے
پاسِ ناموسِ عشق تھا ورنہ — کتنے آنسو پلک تک آئے تھے
میرؔ صاحب رُلا گئے سب کو — کل وے تشریف یاں بھی لائے تھے

خوب ہی اے ابر اک شب آؤ باہم روئیے — پر نہ اتنا بھی کہ ڈوبے شہر کم کم روئیے
وقت خوش دیکھا نہ اک دم سے زیادہ دہر میں — خندۂ صبحِ چمن پر مثلِ شبنم روئیے
اب کے یوں کرنے مقرر اُٹھے جب کہسار سے — وادیٔ مجنوں پہ بھی اے ابر اک دم روئیے

جب نام ترا لیجئے تب چشم بھر آوے
اِس زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آوے

کیا جانیں وہ مرغانِ گرفتارِ چمن کو
جن تک کہ بصد ناز نسیمِ سحر آوے

صناع ہیں سب خوار ازاں جملہ ہوں میں بھی
ہے عیب بڑا اُس میں جسے کچھ ہنر آوے

مشہور چمن میں تری گُل پیرہنی ہے
قرباں ترے ہر عضو پہ نازک بدنی ہے

سمجھے ہے نہ پروانہ، نہ تھامے ہے زبان شمع
وہ سوختنی ہے تو یہ گردن زدنی ہے

ہر چند گدا ہوں میں ترے عشق میں لیکن
ان بوالہوسوں میں کوئی مجھ سا بھی غنی ہے

ہر اشک مرا ہے دُرِ شہوار سے بہتر
ہر لختِ جگر رشکِ عقیقِ یمنی ہے

اب کر کے فراموش تو ناشاد کروگے
پر ہم جو نہ ہوں گے تو بہت یاد کروگے

اس دشت میں اے راہ رواں ہر قدم اوپر
مانندِ جرس نالہ و فریاد کروگے

گر دیکھوگے تم طرزِ کلام اسکی نظر کر
اے اہلِ سخن میر کو استاد کروگے

ہم ہوئے، تم ہوئے، کہ میر ہوئے
اس کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے

نہیں آتے کسو کی آنکھوں میں
ہو کے عاشق بہت حقیر ہوئے

آگے یہ بے ادائیاں کب تھیں
ان دنوں تم بہت شریر ہوئے

قرارِ دل کا یہ کاہے کو ڈھنگ تھا آگے
ہمارے چہرے کے اوپر بھی رنگ تھا آگے

اُٹھائیں تیرے لیے بدزبانیاں اُن کی
جنھوں کی ہم کو خوشامد سے ننگ تھا آگے

اے حبِّ جاہ والو! جو آج تاجور ہی
کل اُس کو دیکھیو تم نے تاج ہی نہ سر ہی

اے ہم صفیر! بے گُل کس کو دماغِ نالہ
مدّت ہوئی ہماری منقار زیر پر ہی

شمعِ اخیرِ شب ہوں سُن سرگزشت میری
پھر صبح ہونے تک تو قصہ ہی مختصر ہی

کر میرؔ اس زمیں میں اور اک غزل تو موزوں
ہی حرف زن قلم بھی اب طبع بھی ادھر ہی

ہر دم قدم کو اپنے رکھ احتیاط سے یاں
یہ کارگاہ ساری دُکانِ شیشہ گر ہی

ڈھایا جنوں نے اسکو ان پر خرابی آئی
جاتا گیا اسی سے دل بھی کسو کا گھر ہی

تیری گلی سے بچ کر کیوں مہر و مہ نہ نکلیں
ہر کوئی جانتا ہے اس راہ میں خطر ہی

وے دن گئے کہ آنسو روتے تھے میرؔ اب تو
آنکھوں میں لختِ دل ہی یا پارۂ جگر ہی

پہنچے ہر اک نہ درد کو میرے
وہ ہی جانے جو ایسا حال رکھے

بحث ہی ناقصوں سے کاش فلک
مجھ کو اس زمرے سے نکال رکھے

سمجھے اندازِ شعر کو میرے
میرؔ کا سا اگر کمال رکھے

شب گئے تھے باغ میں ہم ظلم کے مارے ہوئے
جان کو اپنی گُلِ مہتاب انگارے ہوئے

پھرتے پھرتے عاقبت آنکھیں ہماری مُند گئیں
سو گئے بیہوش تھے ہم راہ کے مارے ہوئے

پیار کرنے کا جو خوباں ہم پہ رکھتے ہیں گناہ

اُن سے بھی تو پوچھتے تم اتنے کیوں پیارے ہوئے

کرے کیا کہ دل بھی تو مجبور ہے — زمیں سخت ہے آسماں دور ہے
تمنائے دل کے لئے جان دی — سلیقہ ہمارا تو مشہور ہے
دل اپنا نہایت ہے نازک مزاج — گرا گر یہ شیشہ تو پھر چور ہے
بہت سعی کرئے تو مر رہیئے میرؔ — بس اپنا تو اتنا ہی مقدور ہے

گفتگو ریختے میں ہم سے نہ کر — یہ ہماری زبان ہے پیارے
چھوڑ جاتے ہیں دل کو تیرے پاس — یہ ہمارا نشان ہے پیارے
میرؔ عمداً بھی کوئی مرتا ہے — جان ہے تو جہان ہے پیارے

زخموں پہ زخم جھیلے داغوں پہ داغ کھائے — یک قطرہ خونِ دل نے کیا کیا ستم اُٹھائے
خوں بستہ جب تلک تھیں دریا رُکے کھڑے تھے — آنسو گرے کروڑوں پلکوں کے ٹک ہلائے
بڑھتیں نہیں پلک سے تا ہم تلک بھی پہنچیں — پھرتی ہیں وے نگاہیں پلکوں کے سائے سائے
پر کی بہار میں جو محبوب جلوہ گر تھے — سو گردشِ فلک نے سب خاک میں ملائے

کشورِ عشق کو آباد نہ دیکھا ہم نے — ہر گلی کوچے میں اُوجڑ پڑے تھے گھر کتنے
دیکھیو پنجۂ مژگاں کی ٹک آتش دستی — ہر سحر خاک میں ملتے ہیں دُرِ تر کتنے
تو ہی بیچارہ گدا میرؔ ترا کیا مذکور — مل گئے خاک میں یاں صاحبِ افسر کتنے

رات گزری ہے مجھے نزع میں روتے روتے — آنکھیں پھر جائیں گی اب صبح کے ہوتے ہوتے
کھول کر آنکھ اڑا دید جہاں کا غافل — خواب ہو جائے گا پھر جاگنا سوتے سوتے

یعقوبؑ کے نہ کلبۂ احزاں تلک گئے — سو کاروانِ مصر سے کنعاں تلک گئے
رہنے نہ دیں گے دشت میں مجنوں کو چین سے — گر ہم جنوں کے مارے بیاباں تلک گئے
کر موسمِ شباب کہاں گل کسے دماغ — بلبل وہ چہچہے انھیں یاراں تلک گئے
کچھ آبلے دیئے تھے رہِ آوردِ عشق نے — سو رفتہ رفتہ خارِ مغیلاں تلک گئے

جن جن کو تھا یہ عشق کا آزار مر گئے — اکثر ہمارے ساتھ کے بیمار مر گئے
یوں کانوں کان گل نے نہ جانا چمن میں آہ — سر کو پٹک کے ہم پسِ دیوار مر گئے
مجنوں نہ دشت میں ہے نہ فرہاد کوہ میں — تھا جن سے لطفِ زندگی وے یار مر گئے
گھبرا نہ میرؔ عشق میں اس سہل زیست پر — جب بس چلا نہ کچھ تو مرے یار مر گئے

ترا ہے وہم کہ میں اپنے پیرہن میں ہوں — نگاہِ غور سے کر مجھ میں کچھ رہا بھی ہے
کہاں تلک شب و روز آہ دردِ دل کہیے — ہر ایک بات کو آخر کچھ انتہا بھی ہے
گزار شہرِ وفا میں سمجھ کے کر مجنوں — کہ اس دیار میں میرؔ شکستہ پا بھی ہے

نہیں کھلتیں آنکھیں تمہاری ٹک کہ مآل پر بھی نظر کرو
یہ جو وہم کی سی نمود ہے اسے خوب دیکھو تو خواب ہے

گئے وقت آتے ہیں ہاتھ کب ہوئے ہیں گنوا کے خراب سب
تجھے کرنا ہووے سو کر تو اب کہ یہ عمر برق شتاب ہے
رکھو آرزوئے مئے خام کی کرو گفتگو خطِ جام کی
کہ سیاہ کاروں سے حشر میں نہ حساب ہے نہ کتاب ہے
مرا شور سن کے جو لوگوں نے کیا پوچھنا تو کہے ہے کیا
جسے میر کہتے ہیں صاحبو یہ وہی تو خانہ خراب ہے

نالے جو آج سنتے ہیں سو ہیں جگر خراش
کیا جانیئے قفس میں گرفتار کون ہے
بازارِ دہر میں ہے عبث میر عرض ہنر
یاں ایسی جنس کا تو خریدار کون ہے

اس فن میں کوئی بے تہ کیا ہو مرا معارض
اوّل تو میں سند ہوں پھر یہ مری زباں ہے
از خویش رفتہ اس بن رہتا ہے میر اکثر
کرتے ہو بات کس سے وہ آپ میں کہاں ہے

نہیں وسواس جی گنوانے کے
ہائے رے ذوق دل لگانے کے
میرے تغییرِ حال پر مت جا
اتفاقات ہیں زمانے کے
دمِ آخر ہی کیا نہ آنا تھا
اور بھی وقت تھے بہانے کے
دل و دیں ہوش و صبر سب ہی گئے
آگے آگے تمہارے آنے کے

خنجر بکف وہ جب سے سفاک ہو گیا ہے
ملک ان ستم زدوں کا سب پاک ہو گیا ہے

زیرِ فلک بھلا تو رووے ہی آپ کو میرؔ
کس کس طرح کا عالم یاں خاک ہو گیا ہے

فقیرانہ آئے صدا کر چلے
میاں خوش رہو ہم دُعا کر چلے

جو تجھ بن نہ جینے کو کہتے تھے ہم
سو اِس عہد کو اب وفا کر چلے

جبیں سجدہ کرتے ہی کرتے گئی
حقِ بندگی ہم ادا کر چلے

کہیں کیا جو پوچھے کوئی ہم سے میرؔ
جہاں میں تم آئے تھے کیا کر چلے

کرو توکّل کہ عاشقی میں نہ یوں کرو گے تو کیا کرو گے
الم جو یہ ہی تو دردمندو! کہاں تلک تم دوا کرو گے

جگر میں طاقت کہاں ہی اتنی کہ دردِ ہجراں سے مرتے رہیے
ہزاروں وعدے وصال کے تھے کوئی بھی جیتے وفا کرو گے

اخیرِ الفت یہی نہیں ہی کہ جل کے آخر ہوئے پتنگے
ہوا جو یاں کی یہ ہی تو یارو غبار ہو کر اُڑا کرو گے

عدم میں ہم کو یہ غم رہے گا کہ اوروں پر اب ستم رہے گا
تمہیں تو لت ہی ستانے ہی کی کبھو پر آخر جفا کرو گے

غمِ محبت سے میرؔ صاحب بہ تنگ ہوں میں فقیر ہو تم
جو وقت ہو گا کبھو مساعد تو میرے حق میں دعا کرو گے

اُٹھے نقاب جہاں سے یارب جس سے تکلّف بیچ میں ہے

جب نکلے اس راہ سے ہو کر منہ تم ہم سے چھپائے گئے

صبح وہ آفت اُٹھ بیٹھا تھا تم نے نہ دیکھا صد افسوس

کیا کیا فتنے سر جوڑے پلکوں کے سائے سلائے گئے

اِدھر سے ابر اُٹھ کر جو گیا ہے — ہماری خاک پر بھی رہ گیا ہے

مصائب اور تھے پر دل کا جانا — عجب اک سانحہ سا ہو گیا ہے

سرہانے میرؔ کے کوئی نہ بولو — ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

عمر بھر ہم رہے شرابی سے — دلِ پُرخون کی اک گلابی سے

کھِلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے — اُس کی آنکھوں کی نیم خوابی سے

برقع اُٹھتے ہی چاند سا نکلا — داغ ہوں اس کی بے حجابی سے

کام تھے عشق میں بہت پر میرؔ — ہم ہی فارغ ہوئے شتابی سے

دیوانِ دوّم

۱

لذت سے نہیں خالی جانوں کا کھپا جانا — کب خضر و مسیحا نے مرنے کا مزا جانا
کب بندگی میری سی بندہ کرے گا کوئی — جانے ہے خدا اس کو میں تجھ کو خدا جانا
اے شورِ قیامت ہم سوتے ہی نہ رہ جائیں — اس راہ سے نکلے تو ہم کو بھی جگا جانا

اُن کے گئے پہ دل کی خرابی نہ پوچھیے — جیسے کسو کا کوئی نگر ہو لٹا ہوا
کہتا تھا میر حال تو جبتک تو تھا بھلا — کچھ ضبط کرتے کرتے ترا حال کیا ہوا

گرمی چراغ کی سی نہیں وہ مزاج میں — اب دل فسردگی سے ہوں جیسے بجھا دیا
کیا کیا زیان میر نے کھینچے ہیں عشق میں — دل ہاتھ سے دیا ہے جدا سر جدا دیا

عالم کی سیر میر کی صحبت میں ہوگئی
طالع سے میرے ہاتھ یہ بے دست و پا لگا

ایک سا عالم نہیں رہتا ہے اس عالم کے بیچ
اب جہاں کوئی نہیں یاں ایک عالم ہو گیا
وقت تب تک تھا تو سجدہ مسجدوں میں کفر تھا
فائدہ اب جب کہ قد محراب سا خم ہو گیا
کیا کہوں کیا طرحیں بدلیں چاہ نے آخر کو میر
تھا گرہ جو درد چھاتی میں سو اب غم ہو گیا

سمجھے تھے ہم تو میر کو عاشق اسی گھڑی
جب سُن کے تیرا نام وہ بیتاب سا ہوا

خُدا کی اُور سے ہے سب یہ اعتبار انہ
جو خوب دیکھو تو میں کچھ ہُنر نہیں رکھتا
غلط ہے دعویٰ عشق اس فضول کا بے ریب
جو کوئی خشک لب اور چشم تر نہیں رکھتا
جدا جدا پھرے ہی میر سب کے کس خاطر
خیال ملنے کا اس کے اگر نہیں رکھتا

اس موج خیز دہر میں تو ہی حباب سا
آنکھیں کھلیں تری تو یہ عالم ہی خواب سا
وہ دل کہ تیرے ہوتے ہے تھا بھرا بھرا
اب اس کو دیکھئے تو ہی اک گھر خراب سا
مزاج آب سا ہے لیکن اُٹھے ہی خاک
ہے میر بحر بے تہ ہستی سراب سا

خوگر نہیں ہم یوں ہی کچھ ریختہ کہنے سے
معشوق جو اپنا تھا باشندہ دکن کا تھا
رہ میر غریبانہ جاتا تھا چلا روتا
ہر گام گہ لب پر یارانِ وطن کا تھا

اک آن اس زمانے میں یہ دل نہ وا ہوا — کیا جانیے کہ میرؔ زمانے کو کیا ہوا
از خویش رفتہ میں ہی نہیں اس کی راہ میں — آتا نہیں ہے پھر کے ادھر کا گیا ہوا
اس بحر میں اک اور غزل تو بھی میرؔ کہہ — دریا تھا تو، تو تیری روانی کو کیا ہوا
لے کر جواب خط کا نہ قاصد پھر آئیو — کیا جانے سرنوشت میں کیا ہے لکھا ہوا

نے صبر ہے نہ ہوش ہے نے عقل ہے نہ دین — آتا ہے اس کے پاس سے عاشق لٹا ہوا
اٹھتا ہے مجھ کے دل سے کبھو جوش سا تو پھر — جاتا ہے دونوں آنکھوں سے دریا بہا ہوا
جوں برق مجھ کو ہنستے نہ دیکھا کسو نے آہ — پایا تو ابر سا کہیں روتا کھڑا ہوا
جس شعر پر سماع تھا کل خانقاہ میں — وہ آج میں سنا تو ہے میرا کہا ہوا

پھرتا ہے زندگی کے لیے آہ خوار کیا — اس وہم کی نمود کا ہے اعتبار کیا
کیا جانیں ہم اسیر قفس زاد اے نسیم! — گل کیسے باغ کہتے ہیں کس کو بہار کیا؟
آنکھیں برنگ نقش قدم ہو گئیں سفید — پھر اور کوئی اس کا کرے انتظار کیا
سرکش کسو سے ایسی کدورت رکھے وہ شوخ — ہم اس کی خاک راہ میں ہم سے غبار کیا
پاتے ہیں اپنے حال میں مجبور سب کو ہم — کہنے کو اختیار ہے پر اختیار کیا

داغ محجوبی ہوں اس کا میں کہ میرے روبرو — عکس اپنا آرسی میں دیکھ کر شرما گیا
ہم بشر عاجز ثبات پا ہمارا کس قدر — دیکھ کر اس کو فلک سے بھی نہ یاں ٹھہرا گیا
ہو گئے تحلیل سب اعضا مرے پا کر گداز — رفتہ رفتہ ہجر کا اندوہ مجھ کو کھا گیا

یہ میرِ ستم کشتہ کسو وقت جواں تھا — اندازِ سخن کا سبب شور و فغاں تھا
جادو کی پڑی پرچۂ ابیات تھا اُس کا — مُنہ تکتے غزل پڑھتے عجب سحر بیاں تھا
جس راہ سے وہ دل زدہ دِلّی میں نکلتا — ساتھ اُس کے قیامت کا سا ہنگامہ رواں تھا
افسردہ نہ تھا ایسا کہ جوں آبِ زدہ خاک — آندھی تھا، بلا تھا، کوئی آشوبِ جہاں تھا
غافل تھے ہم احوالِ دلِ خستہ سے اپنے — وہ گنج اسی کنج خرابہ میں نہاں تھا

نکتہ مشتاق و یار ہے اپنا — شاعری تو شعار ہے اپنا
بے خودی لے گئی کہاں ہم کو — دیر سے اِنتظار ہے اپنا
روتے پھرتے ہیں ساری ساری رات — اب یہی روزگار ہے اپنا
دے کے دل ہم جو ہو گئے مجبور — اس میں کیا اختیار ہے اپنا

کہتے تو ہو یوں کہتے یوں کہتے جو وہ آتا — یہ کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا

جو کچھ نظر پڑے ہے حقیقت میں کچھ نہیں — عالم میں خوب دیکھا تو عالم ہے خواب کا
رو فرصتِ جوانی پہ جوں ابر بے خبر — اندازِ برق کا سا ہے عہدِ شباب کا

بندھا رات آنسو کا کچھ تار سا — ہُوا ابرِ رحمت گنہگار سا
محبت ہے یا کوئی جی کا ہے روگ — سدا میں تو رہتا ہوں بیمار سا

سینے میں شوق میرؔ کے سب درد ہو گیا — دل پر رکھا تھا ہاتھ سو منھ زرد ہو گیا
دفتر لکھے ہیں میرؔ نے دل کے الم کے یہ — یاں اپنے طور و طرز میں وہ فرد ہو گیا

چمن بھی ترا عاشقِ زار تھا — گلِ سرخ اک زرد رخسار تھا
قدِ یار کے آگے سروِ چمن — کھڑا دور جیسے گنہگار تھا
گیا میرؔ یاں سے کرو گے جو یاد — کہو گے کہ مسکین عجب یار تھا

منہ پر اس آفتاب کے ہے یہ نقاب کیا — پردہ رہا ہے کون سا ہم سے حجاب کیا
ہستی ہے اپنے طور پہ جو بحر جوش میں — گرداب کیسا، موج کہاں ہے حباب کیا
دیکھا پلک اٹھا کے تو پایا نہ کچھ اثر — اے عمرِ برق جلوہ گئی تو شتاب کیا
ہر چند میرؔ بستی کے لوگوں سے ہے نفور — پر ہائے آدمی ہے وہ خانہ خراب کیا

ب

غفلت سے ہے غرور تجھے ورنہ ہے بھی کچھ
یاں وہ سماں ہے جیسے کہ دیکھے ہے کوئی خواب

یہ بستیاں اجڑ کے کہیں بستیاں بھی ہیں
دل ہو گیا خراب جہاں پھر رہا خراب

ٹک دل کے نسخے ہی کو کیا کر مطالعہ
اس درس گہ میں حسن ہمارا ہے اک کتاب

کاش اس کے روبرو نہ کریں مجھ کو حشر میں

کتنے مِرے سوال ہیں جن کا نہیں جواب

جو کہو تم سو ہے بجا صاحب — ہم بُرے ہی سہی بھلا صاحب
سادہ ذہنی میں نکتہ چیں تھے ہم — سب تو ہیں حرف آشنا صاحب
شوقِ رُخ، یادِ لب، غمِ دیدار — جی میں کیا کیا مِرے رہا صاحب
کِس نے سُن شعرِ میرؔ یہ نہ کہا — کہیو پھر ہائے کیا کہا صاحب

ہم تم سے چشم رکھتے تھے دِلداریاں بہت
سو التفات کم ہے دِل آزاریاں بہت
دیکھیں تو کیا دِکھائے یہ افراطِ اشتیاق
لگتی ہیں تیری آنکھیں ہمیں پیاریاں بہت
جبتک مِلے جلے سے جفائیں تھیں اُٹھ سکیں
کرنے لگے ہو اب تو ستمگاریاں بہت
شکوہ خراب ہونے کا کیا چاہنے میں میرؔ
ایسی تو اے عزیز ہیں یاں خواریاں بہت

آئینہ پانی پانی رہا اس کے سامنے — کہیے جہاں کہوں یہ تو ہے روبرو کی بات
سرِ گُل نے پھر جھکا کر اُٹھایا نہ شرم سے — گلزار میں چلی تھی کہیں اسکے رو کی بات
بلبل کے بولنے سے ہی کیوں ہے دماغِ گُل — آپس میں یوں تو ہوتی ہے یادہ ہزار بات

منہ تک رہو جو ہو وہ فریبندہ حرف زن
اس تھوڑے سن وسال پہ یہ پیچدار بات

آہو کو اس کی چشم سخن گو سے مت ملا
شہری سے کر سکے ہے کہیں بھی گنوار بات

یوں یار گل سے اب کی جھکے ہیں نہال باغ
جھک جھک کے جیسے کرتے ہیں دو چار یار بات

دیکھیے کب ہو وصال اب تو لگے ہے ڈر بہت
کوفت گزرے ہے فراق یار میں جی پر بہت

دل کی ویسی ہے خرابی کثرت اندوہ سے
جیسے رہ پڑتا ہے دشمن کا کہیں لشکر بہت

کیا سبب ہے اب مکاں پر جو کوئی پاتا نہیں
میر صاحب آگے تو رہتے تھے اپنے گھر بہت

چ

دل کھو گیا ہوں میں نہیں دیوانہ پن کے بیچ
تم بھی تو دیکھو زلف شکن در شکن کے بیچ

کنعاں سے جا کے مصر میں یوسف ہوا عزیز
عزت کسو کی ہوتی نہیں ہے وطن کے بیچ

سرسبز ہند ہی میں نہیں کچھ یہ ریختہ
ہے دھوم میرے شعر کی سارے دکن کے بیچ

کل ہم بھی سیر باغ میں تھے ساتھ یار کے
دیکھا تو اور رنگ ہے سارے چمن کے بیچ

فرہاد و قیس میر یہ آوارگان عشق
یوں ہی گئے ہیں سب کی رہی من کی من کے بیچ

د

سب پریشان دلی میں شب گزری
بال اس کے بکھر گئے شاید

ہیں مکان و سرا و جا خالی
یار سب کوچ کر گئے شاید

لوہو آنکھوں میں اب نہیں آتا
زخم اب دل کے بھر گئے شاید

شور بازار سے نہیں اٹھتا
رات کو میر گھر گئے شاید

ر

اے صبا گر شہر کے لوگوں میں ہو تیرا گزار — کہیو ہم صحرا نوردوں کا تمامی حالِ زار
خاکِ دہلی سے جدا ہم کو کیا یکبارگی — آسماں کو تھی کدورت سو نکالا یوں غبار
طائرانِ خوش لب و لہجہ نہیں رہتے چھپے — شور سے ان کے بھرے ہیں قریہ و شہر و دیار
شہر کے کیا ایک دو کوچوں میں تھی شہرت رہی — شہروں شہروں ملکوں ملکوں ہی انھوں کا اشتہار
شور سن سن کر غزل خوانی کا میرے ہر صغیر — غنچہ ہو آتے جو ہوتا آب و رنگِ شاخسار
خوش نوائی کا جنھیں دعویٰ تھا رہ جاتے خموش — جن کو میں کرتا مخاطب ان کو ہوتا افتخار
بعضوں کو رشکِ قبولِ خاطر و لطفِ سخن — بعضوں کا سینہ فگار و بعضوں کا دل داغدار
ربط کا دعویٰ تھا جن کو کہتے تھے مخلص ہیں ہم — جانتے ہیں ذاتِ سامی ہی کو ہم سب خاکسار
نقل کریے کیا یہ صحبت منعقد جب ہوتی بزم — بیٹھ کر کہتے تھے منہ پر میرے بعضے بعضے یار
بندگی ہے خدمتِ عالی میں ہم کو دیر سے — کر رکھی ہے جان اپنی ہم نے حضرت پر نثار
سو نہ خط ان کا نہ کوئی پرچہ پہنچا یہ تلک — واہ واہی رابطہ رحمت ہے یہ اخلاق و پیار
رفتہ رفتہ ہو گئیں آنکھیں مری دونوں سفید — بسکہ نامے کا کیا یاروں کے میں نے انتظار
لکھتے گر دو حرفِ لطف آمیز بعد از چند روز — تو بھی ہوتا اس دلِ بیتاب و طاقت کو قرار
خط کتابت سے یہ کہتے تھے نہ بھولیں گے تجھے — آویں گے گھر بار کی تیرے خبر کو بار بار
جب گئیں یاد سے تب کس کا گھر کاہے کا پاس — آفریں صد آفریں اے مردمانِ روزگار!

کچھ ہو رہے گا عشق و ہوس میں بھی امتیاز — آیا ہے اب مزاج ترا امتحان پر
کیا رہروانِ راہِ محبت ہیں طرفہ لوگ — اغماض کرتے جاتے ہیں جی کے زیان پر
موزوں کرو کچھ اور بھی شاید کہ میر جی — رہ جائے کوئی بات کسی کی زبان پر

جنوں میں اب کی کام آئی نہ کچھ تدبیر بھی آخر
گئی کل ٹوٹ میرے پاؤں کی زنجیر بھی آخر

اگر ساکت ہیں ہم حیرت سے پر ہیں دیکھنے قابل
کہ اک عالم رکھے ہے عالم تصویر بھی آخر

پھرے ہے باؤلا سا پیچھے ان شہری غزالوں کے
بیاباں مرگ ہوگا اس چلن سے میر بھی آخر

ش

جان آخر تو جانے والی تھی
اس پہ کی ہوتی میں نثار اے کاش

اس میں راہ سخن نکلتی تھی
شعر ہوتا ترا شعار اے کاش

بے اجل میر اب پڑا مرنا
عشق کرتے نہ اختیار اے کاش

کیا کہیے کیا رکھیں ہیں ہم تجھ سے یار خواہش
یک جان و صد تمنا یک دل ہزار خواہش

حالانکہ عمر ساری مایوس گزری تس پر
کیا کیا رکھیں ہیں اس کے امیدوار خواہش

کرتے ہیں سب تمنا پر میر جی نہ اتنی
رکھے گی مار تم کو پایان کار خواہش

ق

دل خواہ کوئی دلبر ملتا تو دل کو دیتے
گر چاہنے میں ہوتا کچھ اختیار عاشق

کیا جانے محو ہے وہ اپنے ہی رو و مو کا
گزرے ہے کس طرح سے لیل و نہار عاشق

اس پردے میں غم دل کہتا ہے میر اپنا
کیا شعر و شاعری ہے یار و شعار عاشق

کیا کہوں تم سے میں کہ کیا ہے عشق
جان کا روگ ہے بلا ہے عشق

عشق ہی عشق ہے جہاں دیکھو
سارے عالم میں بھر رہا ہے عشق

عشق معشوق عشق عاشق ہے — یعنی اپنا ہی مبتلا ہے عشق
کوئی خواہاں نہیں مُحبت کا — تو کہے جنسِ روا ہے عشق
میر جی زرد ہوتے جاتے ہو — کیا کہیں تم نے بھی کیا ہے عشق

ک

غافل ہیں ایسے سوتے ہیں گویا جہاں کے لوگ — حالانکہ رفتنی ہیں سب اس کارواں کے لوگ
رونق تھی دل میں جب تئیں بستی تھی دلبراں — اب کیا رہا ہے اُٹھ گئے سب اس مکاں کے لوگ
بُت چیز کیا کہ جس کو خدا مانتے ہیں سب — خوش اعتقاد کتنے ہیں ہندوستاں کے لوگ
منہ تکتے ہی رہے ہیں سدا مجلسوں کے بیچ — گویا کہ میر محو ہیں میری زباں کے لوگ

پاؤں میں پڑ گئے ہیں پھپھولے مرے تمام — ہر گام راہِ عشق میں گویا دبی ہے آگ
جَل جَل کے سب عمارتِ دل خاک ہو گئی — کیسے نگر کو آہ محبت نے دی ہے آگ
یارب ہمیشہ جلتی ہی رہتی ہیں چھاتیاں — یہ کیسی عاشقوں کے دلوں میں لگی ہے آگ

م

سوکھ غم سے ہوئے ہیں کانٹا سے — پَر دلوں میں کھٹک رہے ہیں ہم
وقفۂ مرگ اب ضروری ہے — عمر طے کرتے تھک رہے ہیں ہم
کون پہنچے ہے بات کی تہ کو — ایک مدت سے بک رہے ہیں ہم
نقشِ پا سے رہی ہیں کھل آنکھیں — کِس کی یوں راہ تک رہے ہیں ہم

یہی جانا کہ کچھ نہ جانا ہائے — سو بھی اک عمر میں ہوا معلوم

گرچہ تو ہی ہے سب جگہ لیکن — ہم کو تیری نہیں ہے جا معلوم
عشق جانا تھا مار رکھے گا — ابتدا میں تھی انتہا معلوم

تدبیریں کریں اپنے تنِ زار و زبوں کی — افراط سے اندوہ کے ہوں آپ میں جب ہم
یک سلسلہ ہے قیس کا فرہاد کا اپنا — جوں حلقۂ زنجیر گرفتار ہیں سب ہم
آغازِ محبت میں تمامی ہوئی اپنی — اے وائے ہوئے خاک بسر راہ طلب ہم

آوارہ گرد باد سے تھے ہم یہ شہر میں — کیا خاک میں ملا ہے یہ دیوانہ پن تمام
اِک گل زمیں نہ وقفے کے قابل نظر پڑی — دیکھا برنگِ آبِ رواں یہ چمن تمام
میں خاک میں ملا نہ کروں کس طرح سفر — مجھ سے غبار رکھتے ہیں اہلِ وطن تمام
کچھ ہند ہی میں میر نہیں لوگ جیب چاک — ہے میرے ریختوں کا دِوانہ دکن تمام

حکم آبِ رواں رکھے ہے حسن — بہتے دریا میں ہاتھ دھولو تم
کیا سرا ہیں ہم اپنی جنس کو لیک — دِل عجب ہے متاع جو لو تم
جانا آیا ہے اب جہاں سے ہمیں — تھوڑی تو دور ساتھ ہو لو تم
رات گذری ہے سب تڑپتے میر — آنکھ لگ جائے ٹک تو سو لو تم

ن

منھ مجھ کو کھڑے صاف بُرا کہتے ہیں — چپکے تم سنتے ہو بیٹھے اسے کیا کہتے ہیں
دیکھے خوباں کے بجا دِل نہیں رہتا ہرگز — لوگ جو کچھ انہیں کہتے ہیں بجا کہتے ہیں

عشق کے شہر کی بھی رسم کے ہیں کشتے ہم　　درد جانکاہ جو ہو اس کو دوا کہتے ہیں
حسن تو ہے ہی کرو لطفِ زباں بھی پیدا　　میرؔ کو دیکھو کہ سب لوگ بھلا کہتے ہیں

فریاد کوئی شب روز کریاں　　ہمیشہ کون رہتا ہے سرا میں
کہے ہے ہر کوئی اللہ میرا　　عجب نسبت ہے بندے میں خدا میں
بلا تہ دار بحرِ عشق نکلا　　نہ ہم نے انتہا پائی ابتدا میں

دیر و حرم سے تو تو ٹک گرم ناز نکلا　　ہنگامہ ہو رہا ہے اب شیخ و برہمن میں
آجاتے شہر میں تو جیسے کہ آندھی آئی　　کیا وحشتیں اٹھائیں ہم نے دوانے پن میں
ہیں گھاؤ دل پر اپنے تیغ زباں سے سب کی　　تب درد ہے ہمارے اے میرؔ ہر سخن میں

کیا جانوں دل کو کھینچے ہیں کیوں شعر میرؔ کے　　کچھ ایسی طرز بھی نہیں ایہام بھی نہیں
ایام ہجر کریئے بسر کس امید پر　　ملنا انھوں کا صبح نہیں شام بھی نہیں

کرتے ہیں جو کہ جی میں ٹھانے ہیں　　خوبرو کس کی بات مانے ہیں
اب تو افسردگی ہی ہے ہر آن　　وے نہ ہم ہیں نہ وے زمانے ہیں
قیس و فرہاد کے وہ عشق کے شور　　اب مرے عہد میں فسانے ہیں
مشک و سنبل کہاں وہ زلف کہاں　　شاعروں کے یہ شاخسانے ہیں
عشق کرتے ہیں اس پری رو سے　　میرؔ صاحب بھی کیا دوانے ہیں

کرتا نہیں قصور ہمارے ہلاک میں — یارب! یہ آسماں بھی جل جائے خاک میں

اب کے جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے — دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

کہئے لطافت اُس تنِ نازک کی میر کیا — شاید یہ لطف ہوگا کسو جانِ پاک میں

آج ہمارے گھر آیا تو کیا ہے یاں جو نثار کریں — اِلّا کھینچ بغل میں تجھکو دیر تلک ہم پیار کریں

شیوہ اپنا بے پروائی نومیدی سے ٹھہرا ہے — کچھ بھی وہ مغرور دبے تو منت ہم سو بار کریں

پتا پتا گلشن کا تو حال ہمارا جانے ہے — اور کہے تو جس سے اَے گُل بے برگی اظہار کریں

بے گانہ وضع برسوں اس شہر میں رہا ہوں — بھاگوں ہوں دور سب سے میں کس کا آشنا ہوں

کیا کیا کیا تامل اس فکر میں گیا گھل — سمجھا نہ آپ کو میں کیا جانئے کہ کیا ہوں

مجھ کو بلا ہے وحشت اے میر دور اس سے — جاگہ سے جب اٹھا ہوں آشوب سا اٹھا ہوں

کل دیکھتے ہمارے بستے تھے گھر برابر — اب یہ کہیں کہیں جو دیوار و در رہے ہیں

کیا آج ڈبڈبائی دیکھو ہو تم یہ آنکھیں — جوں چشمہ یوں ہی برسوں ہم چشم تر رہے ہیں

کیا یہ سرائے فانی ہی جائے باش اپنی — ہم یاں مسافرانہ آکر اتر رہے ہیں

چل ہمنشیں سنے تو ایک آدھ بیت سنئے — کہتے ہیں بعد مدت میر اپنے گھر رہے ہیں

عشق میں جی کو صبر و تاب کہاں — اُس سے آنکھیں لگیں تو خواب کہاں

ہستی اپنی ہے بیچ میں پردا — ہم نہ ہوویں تو پھر حجاب کہاں

گو یہ شب سے سُرخ ہیں آنکھیں ۔ مجھ بلانوش کو شراب کہاں
عشق ہے عاشقوں کے جلنے کو ۔ یہ جہنّم میں ہے عذاب کہاں
عشق کا گھر ہے میرؔ سے آباد ۔ ایسے پھر خانماں خراب کہاں

یارو مجھے معاف رکھو میں نشے میں ہوں ۔ اب دو تو جام خالی ہی دو میں نشے میں ہوں
مستی سے درہمی ہے مری گفتگو کے بیچ ۔ جو چاہو تم بھی مجھ کو کہو میں نشے میں ہوں
یا ہاتھوں ہاتھ لو مجھے مانندِ جامِ مے ۔ یا تھوڑی دور ساتھ چلو میں نشے میں ہوں
نازک مزاج آپ قیامت ہیں میرؔ جی ۔ جوں شیشہ میرے منھ نہ لگو میں نشے میں ہوں

باغ گو سبز ہوا اب سرِ گلزار کہاں ۔ دل کہاں وقت کہاں عمر کہاں یار کہاں
تم تو اب آنے کو پھر کہہ چلے ہو کل لیکن ۔ بے کل ایسا ہی رہا شب تو یہ بیمار کہاں
دل کی خواہش ہو کسو کو تو کجی دل کی نہیں ۔ اب یہی جنس بہت ہے یہ خریدار کہاں
خاک یاں چھانتے ہی کیوں نہ پھرو دل کے لیے ۔ ایسا پہنچے ہے بہم پھر کوئی غمخوار کہاں

جور کیا کیا جفائیں کیا کیا ہیں ۔ عاشقی میں بلائیں کیا کیا ہیں
فکرِ تعمیر دل کسو کو نہیں ۔ ایسی ویسی بنائیں کیا کیا ہیں
گہ نسیمِ صبا ہے گاہ سموم ۔ اس چمن میں ہوائیں کیا کیا ہیں

گہے تر رہیں گاہ خوں بستہ تھیں ۔ ان آنکھوں نے کیا کیا دکھایا ہمیں

رہتا اُس کی خاطر میں نقشِ وفا　　نہیں تو اُٹھا لے خدایا ہمیں
کوئی دم کل آئے تھے مجلس میں میر　　بہت اس غزل پر رُلایا ہمیں

ہم نے یہ مانا کہ واعظ ہے مَلک　　آدمی ہونا بہت مُشکل ہے میاں
مرنے کے پیچھے تو راحت سچ ہے لیک　　بیچ میں یہ واقعہ حائل ہے میاں
دِل لگے اتنے جہاں میں کس لئے　　رہ گزر ہے یہ تو کیا منزل ہے میاں
کیا دلِ مجروح و محزوں کا گلہ　　ایک غمگیں دوسرے گھائل ہے میاں
مُستعِدوں پر سخن ہے آج کل　　شعر اپنا فن سو کس قابل ہے میاں

رُوئے سخن جو ہے تو مرا چشمِ دل کی اور　　تم سے خدا نخواستہ مجھ کو گلا نہیں
رنگ اور بو، تو دِلکش و دِل چسپ ہیں کمال　　لیکن ہزار حیف کہ گُل میں وفا نہیں
ان نے تو آنکھیں موند لیاں ہیں ادھر سے دل　　ایک آدھ دن میں دیکھیے اِن کیا ہی کیا نہیں
اُٹھتے ہو میر دیر سے تو کعبے چل رہو　　مغموم کاہے کو ہو تمہارے خدا نہیں؟

و

سائے میں ہر پلک کے خوابیدہ ہے قیامت　　اُس فِتنۂ زماں کو کوئی جگا تو دیکھو
ڈوبے ہے کشتی میری بحرِ عمیق غم میں　　بیگانے سے کھڑے ہو تم آشنا تو دیکھو
ہے اس چمن میں وہ گُل صد رنگ محوِ جلوہ　　دیکھو جہاں وہی ہے کچھ اس سوا تو دیکھو
اشعار میر پر ہے اب ہائے وائے ہر سو　　کچھ سحر تو نہیں ہے لیکن ہوا تو دیکھو

ہو کوئی بادشاہ کوئی یاں وزیر ہو — اپنی بلا سے بیٹھ رہے جب فقیر ہو
چھاتی قفس میں داغ سے ہو کیوں نہ رشکِ باغ — جوشِ بہار تھا کہ ہم آئے اسیر ہو
حد سے زیادہ جور و ستم خوشنما نہیں — ایسا سلوک کر کہ تدارک پذیر ہو
دم بھر نہ ٹھہرے دل میں نہ آنکھوں میں ایک پل — اِتنے سے قد پہ تُم بھی قیامت شریر ہو
یک وقتِ خاص حق میں مرے کچھ دعا کرو — تم بھی تو میر صاحب و قبلہ فقیر ہو

مُطرِب نے پڑھی تھی غزل اک میر کی شب کو — مجلس میں بہت وجد کی حالت رہی سب کو
کیا وجہ کہیں خونِ شُدنِ دل کی پیارے! — دیکھو تو ہو آئینے میں تم جنبشِ لب کو
ہوگا کسو دیوار کے سائے میں پڑا میر — کیا ربطِ محبت سے اُس آرام طلب کو

(ہ)

ہر آن ہم کو تجھ بن ایک اک برس ہوئی ہے — کیا آ گیا زمانہ اے یار رفتہ رفتہ
پامال ہوں کہ اس میں ہوں خاک سے برابر — اب ہو گیا ہے سب کچھ ہموار رفتہ رفتہ

یہ جو مُہلت جسے کہیں ہیں عمر — دیکھو تو انتظار سا ہے کچھ
منہ نہ ہم جبریوں کا کھلواؤ — کہنے کو اختیار سا ہے کچھ

(ی)

کچھ کرو فکر مجھ دِوانے کی — دُھوم ہے پھر بہار آنے کی
وہ جو پھرتا ہے مجھ سے دور ہی دور — ہے یہ تقریب جی کے جانے کی
تیز یوں ہی نہ تھی شبِ آتشِ شوق — تھی خبر گرم اُس کے آنے کی

جو ہے سو پائمالِ غم ہے میرؔ　　چال بے ڈول ہے زمانے کی

میرؔ دریا ہے سنے شعر زبانی اسکی　　اللہ اللہ رے طبیعت کی روانی اسکی
ایک ہے عہد میں اپنے وہ پراگندہ مزاج　　اپنی آنکھوں میں نہ آیا کوئی ثانی اسکی
بات کی طرز کو دیکھو تو کوئی جادو تھا　　پر ملی خاک میں کیا سحر بیانی اس کی
سرگزشت اپنی کس اندوہ سے شب کہتا تھا　　سو گئے تم نہ سنی آہ کہانی اس کی
مرثیے دل کے کئی کہہ کے دیئے لوگوں کو　　شہر دلی میں ہے سب پاس نشانی اس کی
آبلے کی سی طرح ٹھیس لگی پھوٹ بہے　　دردمندی میں گئی ساری جوانی اس کی

کیا رنگ و بو و بادِ سحر سب ہیں گرمِ راہ　　کیا ہے جو اس چمن میں ہے ایسی چلا چلی
یہ جور و جور کش تھے کہاں آگے عشق میں　　تجھ سے جفا و میرؔ سے رسمِ وفا چلی

لطف پر اس کے ہم نشیں مت جا　　کبھو ہم پر بھی مہربانی تھی
عاشقی جی ہی لے گئی آخر　　یہ بلا کوئی ناگہانی تھی
اس رخِ آتشیں کی شرم سے رات　　شمعِ مجلس میں پانی پانی تھی
فقر پر بھی تھا میرؔ کے اک رنگ　　کفنی پہنی سو زعفرانی تھی

دیکھا تو مثلِ اشک نظر سے گرا دیا　　اب میری اس کی آنکھ میں عزت نہیں رہی
پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ　　افسوس تم کو میرؔ سے صحبت نہیں رہی

مطرب سے غزل میرؔ کی کل میں نے پڑھائی
اللہ رے اثر سب کے تئیں رفتگی آئی

ہر بحر میں اشعار کہے عمر کو کھویا
اس گوہرِ نایاب کی کچھ بات نہ پائی

فریاد انھیں رنگوں کی گلزار میں ہر صبح
بلبل نے مری طرزِ سخن صاف اڑائی

گردش میں جو ہیں میرؔ مہ و مہر ستارے
دن رات ہمیں رہتی ہے یہ چشم نمائی

اسیرِ زلف کرے قیدیِ کمند کرے
پسند اسکی ہے وہ جس طرح پسند کرے

ہمیشہ چشم ہے نمناک ہاتھ دل پر ہے
خدا کسو کو نہ ہم سا بھی دردمند کرے

سخن یہی ہے جو کہتے ہیں شعرِ میرؔ ہے سحر
زبانِ خلق کو کس طور کوئی بند کرے

آنکھوں ہی میں رہے ہو دل سے نہیں گئے ہو
حیران ہوں یہ شوخی آئی تمھیں کہاں سے

خاموشی ہی میں ہم نے دیکھی ہے مصلحت اب
ہر اک سے حال دل کا مدت کہا زباں سے

اتنی بھی بد مزاجی ہر لحظہ میرؔ تم کو
الجھاؤ ہے زمیں سے جھگڑا ہے آسماں سے

وہ ناز سے چلا کہیں تو حشر ہو چکی
پھر بحث آپڑے گی اسی کے خرام سے

دل اور عرش دونوں پہ گویا ہے اک سیر
کرتے ہیں باتیں میرؔ جی کس کس مقام سے

الٰہی کہاں منہ چھپایا ہے تو نے
ہمیں کھو دیا ہے تری جستجو نے

جو خواہش نہ ہوتی تو کاہش نہ ہوتی
ہمیں جی سے مارا تری آرزو نے

تری چال ٹیڑھی تری بات روکھی
تجھے میرؔ سمجھا ہے یاں کم کسو نے

یاں ہم برائے بیت جو بے خانماں رہے — سو یوں رہے کہ جیسے کوئی میہماں رہے
تھا ملک جن کے زیر نگیں صاف مٹ گئے — تم اس خیال میں ہو کہ نام و نشاں رہے
دیکھیں تو مصرِ حسن میں کیا خواریاں کھنچیں — ابتک تو ہم عزیز رہے ہیں جہاں رہے
اِک قافلے سے گرد ہماری نہ تک اٹھی — حیرت ہے میر اپنے تئیں ہم کہاں رہے

گُل گئے، بوٹے گئے، گلشن ہوئے برہم گئے
کیسے کیسے ہائے اپنے دیکھتے موسم گئے
ہنستے رہتے تھے جو اس گلزار میں شام و سحر
دیدۂ تر ساتھ لے وے لوگ جوں شبنم گئے
شاید اب ٹکڑوں نے دل کے قصد آنکھوں کا کیا
کچھ سبب تو ہے جو آنسو آتے آتے تھم گئے
سبزہ و گل خوش نشینی اس چمن کی جن کو تھی
سو بھی تو دیکھا گریباں چاک و مژگاں نم گئے

خرابی دل کی کیا انبوہِ درد و غم سے پوچھو ہو
وہی حالت ہے جیسے شہر لشکر لوٹ جاتا ہے
شِکست اس رنگ آئی ہے خودئ عشق میں دل پر
نشے میں مست سے جیسے کہ شیشہ پھوٹ جاتا ہے

چھاتی جلا کرے ہے سوزِ دروں بلا ہے — اک آگ سی رہے ہے کیا جانیئے کہ کیا ہے

میں اور تو ہیں دونوں مجبور طور اپنے — پیشہ ترا جفا ہے شیوہ مرا وفا ہے

کچھ بے سبب نہیں ہے خاطر مری پریشاں — دل کا الم جدا ہے غم جان کا جدا ہے

پھرتے ہو میر صاحب سب سے جدے جدے تم — شاید کہیں تمہارا دل ان دنوں لگا ہے

آغاز تو یہ ہے کچھ روتے ہیں خون ہر دم — کیا جانے عاشقی کا یارو مآل کیا ہے

سرگرم جلوہ اس کو دیکھے کوئی سو جانے — طرزِ خرام کیا ہے، حسن و جمال کیا ہے

گہ آپ میں نہیں ہو گہ منتظر کہیں ہو — کچھ میر جی تمہارا ان روزوں حال کیا ہے

ہم آپ سے گئے سو الٰہی کہاں گئے — مدت ہوئی کہ اپنا ہمیں انتظار ہے

سب فکر خانہ سازی میں منعم ہلاک ہیں — بنیاد زندگانی کی ناپائدار ہے

کب تک ستم کبھو تو دلاسا بھی دیجئے — بالفرض میر ایسا ہی تقصیروار ہے

آنکھیں ہماری دیکھیں لوگوں نے اشک افشاں — اب چاہ کا کسو کے پردہ رہا نہیں ہے

منہ جن نے میرا دیکھا ایک آہ دل سے کھینچی — اس دردِ عاشقی کی آیا دوا نہیں ہے

کریئے جو ابتدا تو تا حشر حال کہیے — عاشق کی گفتگو کو کچھ انتہا نہیں ہے

میں روؤں تم ہنسو ہو کیا جانو میر صاحب — دِل آپ کا کسو سے شاید لگا نہیں ہے

کیا حال بیاں کرے عجب طرح پڑی ہے — وہ طبع تو نازک ہے کہانی یہ بڑی ہے

ہے چشمک انجم طرف اس مہ کے اشارہ
دیکھو تو مری آنکھ کہاں جا کے لڑی ہے

وے دن گئے جو ہجر میں لگی رہتی تھیں انکھیں
اب یاں ہمیں مہلت کوئی پل کوئی گھڑی ہے

وہ زلف نہیں منعکس دیدۂ تر میر
اس بحر میں اشعار سے زنجیر پڑی ہے

کوفت سے جان لب پہ آئی ہے
ہم نے کیا چوٹ دل پہ کھائی ہے

لکھتے رقعہ لکھے گئے دفتر
شوق نے بات کیا بڑھائی ہے

دیدنی ہے شکستگی دل کی
کیا عمارت غموں نے ڈھائی ہے

ہے تصنع کہ لعل ہیں وے لب
یعنی اک بات سی، بنائی ہے

بیستوں کیا ہے کوہکن کیسا ؟
عشق کی زور آزمائی ہے

مرگ مجنوں سے عقل گم ہے میر
کیا دوانے نے موت پائی ہے

کیا پوچھتے ہو عاشق راتوں کو کیا کرے ہے
گاہے بکا کرے ہے گاہے دعا کرے ہے

ہم طور عشق سے تو واقف نہیں ہیں لیکن
سینے میں جیسے کوئی دل کو ملا کرے ہے

کیا چال یہ نکالی ہو کر جوان تم نے
اب جب چلو ہو دل کو ٹھوکر لگا کرے ہے

اک آفت زماں ہے یہ میر عشق پیشہ
پردے میں سارے مطلب اپنے ادا کرے ہے

شعر میرے ہیں سب خواص پسند
پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

سہل ہے میر کا سمجھنا کیا
ہر سخن اس کا اک مقام سے ہے

ٹک رُک کے صاف طینت نکلے ہے اور کچھ ہو
پانی گرہ جو ہووے تو پھر گہر بنے ہے
برسوں لگی رہی ہیں جب مہر و مہ کی آنکھیں
تب کوئی ہم سا صاحب صاحب نظر بنے ہے
یارانِ دَیر و کعبہ دونوں بُلا رہے ہیں
اب دیکھیں میرؔ اپنا جانا کدھر بنے ہے

دیوانِ سوم

ا

میرے مالک نے مرے حق میں یہ احسان کیا
خاکِ ناچیز تھا میں سو مجھے انسان کیا

اِنتہا شوق کی دل کے جو صبا سے پوچھی
اِک کفِ خاک کوئی اُن نے پریشان کیا

مجھ کو شاعر نہ کہو میرؔ کہ صاحب میں نے
درد و غم کتنے کئے جمع تو دیوان کیا

دِل عجب شہر تھا خیالوں کا
لوٹا مارا ہے حسن والوں کا

دم نہ لے اس کی زُلفوں کا مارا
میرؔ کاٹا جیئے نہ کالوں کا

سینہ کوبی ہی طپش سے غم ہوا
دِل کے جانے کا بڑا ماتم ہوا

آگیا یوں ہی خراماں وہ تو پھر
حشر کا ہنگامہ ہی برہم ہوا

درہمی سے برہمی سے دیکھیو
دونوں عالم کا عجب عالم ہوا

جسمِ خاکی کا جہاں پردہ اُٹھا
ہم ہوئے وہ میرؔ وہ سب ہم ہوا

ب

کل کچھ صبا ہوئی تھی گل افشاں قفس میں بھی
وہ بے کلی تو جان کو بارے نہیں ہے اب

زردیٔ چہرہ اب تو سفیدی کو کھنچ گئی
وہ رنگ آ گئے کا سا پیارے نہیں ہے اب

مسکن جہاں تھا دل نہ وہ مسکیں کا ہم تو وا
کل دیر تیر میر پکارے نہیں ہے اب

بولا جو ہو پریشاں آ نکلے میر صاحب
آنا ہوا کہاں سے کہیئے فقیر صاحب

ہر لحظہ اک شرارت ہر دم ہے یک اشارت
اس عمر میں قیامت تم ہو شریر صاحب

بندے پہ اب نوازش کیجے تو کیجئے ورنہ
کیا لطف ہے جو آئے وقت اخیر صاحب

شیون میں شب کے ٹوٹی زنجیر میر صاحب
اب کیا مرے جنوں کی تدبیر میر صاحب

کب ہیں جوانی کے سے اشعار شور آور
شاید کہ کچھ ہوئے ہیں اب پیر میر صاحب

تم کس خیال میں ہو تصویر سے جو چپ ہو
کرتے ہیں لوگ کیا کیا تقریر میر صاحب

شعر کے پردے میں میں نے غم سنایا ہے بہت
مرثیے نے دل کے میرے بھی رلایا ہے بہت

وادی و کہسار میں روتا ہوں ڈھاڑیں مار مار
دلبران شہر نے مجھ کو ستایا ہے بہت

میر گم گشتہ کا ملنا اتفاقی امر ہے
جب کبھو پایا ہے خواہش مند پایا ہے بہت

اس شہر حسن میں تو کہیں ذکر بھی نہیں
کیا جانئے کہ مہر و وفا ہے کہاں کی بات

اختر شناس کو بھی خلل ہے دماغ کا
پوچھو اگر زمیں سے کہیں آسماں کی بات

لے شام سے جہاں میں ہے تا صبح ایک شور
اپنی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آتی یاں کی بات

زخم جھیلے داغ بھی کھائے بہت　　دل لگا کر ہم تو پچھتائے بہت
پھول، گل، شمس و قمر سارے ہی تھے　　پر ہمیں ان میں تمہیں بھائے بہت
میرؔ سے پوچھا جو میں عاشق ہو تم　　ہو کے کچھ چپکے سے شرمائے بہت

(غ)

صحبت کسو سے رکھنے کا اس کو نہ تھا دماغ
تھا میرؔ بے دماغ کو بھی کیا بلا دماغ
دو حرف زیر لب کہے پھر ہو گیا خموش
یعنی کہ بات کرنے کا کس کو رہا دماغ
آتش زبانی شمع نمط میرؔ کی بہت
اب چاہیے معاف رکھیں جل گیا دماغ

(م)

جو رہے یوں ہیں غم کے مارے ہم　　تو یہی آج کل سدھارے ہم
دن گزرتا ہے دم شماری میں　　شب کو رہتے ہیں گنتے تارے ہم
ہے مروت سے اپنی وحشت دور　　انس رکھتے ہیں تم سے پیارے ہم
زندگی بار دوش آج ہے یاں　　دیکھیں گے کل جو ہوں گے یارے ہم
میرؔ آؤ گے آپ میں بھی کبھو　　سخت مشتاق ہیں تمہارے ہم

(ن)

عشق نے خوار و ذلیل کیا ہم سر کو بکھیرے پھرتے ہیں
سوز و درد و داغ و الم سب جی کو گھیرے پھرتے ہیں

ہر شب ہوں سرگشتہ و نالاں اس بِن کوچہ و برزن میں
یاس نہیں ہے اب بھی دیکھوں کب دن میرے پھرتے ہیں
بے خود اُس کی زلف و رخ کے کاہے کو آپ میں پھر آئے
ہم رکھتے ہیں تسلّی دِل کو سانجھ سویرے پھرتے ہیں

بے دماغی، بے قراری، بے کسی، بے طاقتی — کیا جیے وہ جس کے جی کو روگ اکثر رہیں
زندگی دو بھر ہوئی ہے میرؔ آخر تا کجا — دِل جگر جلتے رہیں آنکھیں ہماری تر رہیں

رفتگاں میں جہاں کے ہم بھی ہیں — ساتھ اس کارواں کے ہم بھی ہیں
شمع ہی سر نہ دے گئی برباد — کُشتہ اپنی زباں کے ہم بھی ہیں
بوسہ مت دے کسو کے در پہ نسیم! — خاک اس آستاں کے ہم بھی ہیں
وجہ بیگانگی نہیں معلوم — تم جہاں کے واں کے ہم بھی ہیں

تھا شوق مجھے طالبِ دیدار ہوا میں — سو آئینہ سا صورتِ دیوار ہوا میں
جب دُور گیا قافلہ تب چشم ہوئی باز — کیا پُوچھتے ہو دیر خبردار ہوا میں
بازارِ وفا میں سرِ سودا تھا سبھوں کو — پر بیچ کے جی ایک خریدار ہوا میں
تم اپنی کہو عشق میں کیا پوچھو ہو میری — عظمت گئی، رُسوائی ہوئی، خوار ہوا میں

شہروں، ملکوں میں جو یہ میرؔ کہاتا ہے میاں — دیدنی ہے پہ بہت کم نظر آتا ہے میاں

عالم آئینہ ہے جس کا وہ مصوّر بے مثل ‏ ‏ ہائے کیا صورتیں پردے میں بناتا ہے میاں
ہو کے عاشق ترے جان و دل و دیں کھو بیٹھے ‏ ‏ جیسا کرتا ہے کوئی ویسا ہی پاتا ہے میاں

جائے ہے جی نجات کے غم میں ‏ ‏ ایسی جنت گئی جہنم میں
پر کے تھی بے کلی قفس میں بہت ‏ ‏ دیکھیے اب کے گل کے موسم میں
آپ میں ہم نہیں تو کیا ہے عجب ‏ ‏ دُور اُس سے رہا ہے کیا ہم میں
بے خودی پر نہ میرؔ کی جاؤ ‏ ‏ تم نے دیکھا ہے اور عالم میں

دور اس سے جی چکے ہیں ہم اس روزگار میں ‏ ‏ دن آج کا بھی سانجھ ہوا انتظار میں
کس کس ادا سے ریختے میں نے کہے ولیک ‏ ‏ سمجھا نہ کوئی میری زبان اس دیار میں
تڑپے ہے متصل وہ کہاں ایسے روز و شب ‏ ‏ ہے فرق میرؔ برق و دلِ بے قرار میں

مصرع کوئی کوئی کبھو موزوں کروں ہوں میں
کس خوش سلیقگی سے جگر خوں کروں ہوں میں
کب بے دماغی شہر سے دیتی ہے اُٹھنے میرؔ
یوں تو خیالِ وادیٔ مجنوں کروں ہوں میں

و

قتل کیے پر غصہ کیا ہے لاش مری اُٹھوانے دو
جان سے ہم بھی جاتے رہے ہیں تم بھی آؤ جانے دو

اُس کی گلی کی خاک سبھوں کے دامنِ دل کو کھینچے ہے
ایک اگر جی لے بھی گیا تو آتے ہیں مرجانے دو

کرتے ہو تم نیچی نظریں یہ بھی کوئی مروّت ہے
برسوں سے پھرتے ہیں جدا ہم آنکھ سے آنکھ ملانے دو

اب کی بہت ہے شورِ بہاراں ہم کو مت زنجیر کرو
دل کی ہوس کچھ ہم بھی نکالیں دھومیں ہم کو مچانے دو

عرصہ کتنا سارے جہاں کا وحشت پر جو آجاویں
پاؤں تو ہم پھیلاویں گے پر فرصت ہم کو پانے دو

کیا جاتا ہے اس میں ہمارا چپکے ہم تو بیٹھے ہیں
دل جو سمجھنا تھا سو سمجھا ناصح کو سمجھانے دو

ضعف بہت ہے میرؔ تمہیں کچھ اسکی گلی میں مت جاؤ
صبر کرو کچھ اور بھی صاحب طاقت جی میں آنے دو

بات بنا نا مشکل سا ہے شعر سبھی یاں کہتے ہیں
فکرِ بلند سے یاروں کو ایک ایسی غزل کہ لانے دو

شب آنکھ مری لگنے نہیں دیتی ہے بلبل
اس مرغ کی بے تابیٔ آواز تو دیکھو

سب میرؔ کو دیتے ہیں جگہ آنکھوں پہ اپنی
اس خاکِ رہِ عشق کا اعزاز تو دیکھو

بارے دنیا میں رہو غم زدہ یا شاد رہو
ایسا کچھ کر کے چلو یاں کہ بہت یاد رہو

عشق پیچے کی طرح حسن گرفتاری ہے
لطف کیا سرو کے مانند اگر آزاد رہو

ہم کو دیوانگی شہروں ہی میں خوش آتی ہے
دشت میں قیس رہو کوہ میں فرہاد رہو

میرؔ بل بل کے بہت خوش ہوئے تم سے سارے
اس خرابے میں مری جان تم آباد رہو

ہ

آنکھیں جو ہوں تو عین ہے مقصود ہر جگہ
بالذات ہے جہاں میں وہ موجود ہر جگہ

واقف ہو شانِ بندگی سے قید قبلہ کیا
سر ہر کہیں جھکا کہ ہے مسجود ہر جگہ

ہیں دلی لکھنؤ کے خوش اندام خوب لیک
راہِ وفا و مہر ہے مسدود ہر جگہ

نہ باتیں کرو سرگرانی کے ساتھ
مری زیست ہے مہربانی کے ساتھ

کہے میں نے اشعار ہر بحر میں
ولیکن قیامت روانی کے ساتھ

شتابی گئی اس روش فصلِ گل
کہ جوں رفتگی ہو جوانی کے ساتھ

جلا جی بہت قصۂ میرؔ سن
بلا سوز تھا اس کہانی کے ساتھ

ی

شور کیا جو اس کی گلی میں رات کو ہیں سب جان گئے
آہ و فغاں کے طور سے میرے لوگ مجھے پہچان گئے

مہلتِ عمر دو روزہ کتنی کریئے فضولی کاہے پہ
آئے جو ہیں دنیا میں ہم تو جیسے کہیں مہمان گئے

ہاتھ لگا وہ گوہرِ مقصد جیسا ہے معلوم ہمیں

محو طلب ہو اہلِ طلب سب خاک بھی یاں کی چھان گئے
کہیے سلوک اُنھوں کے کیا کیا چھیڑ تجاہل کی ہے نئی
نکلے تھے اس رستے سو دے جان کے بھی انجان گئے
میرؔ نظر کی دل کی طرف کی عرش کی جانب فکر بہت
تھی جو طلب مطلوب کی ہم کو کیدھر کیدھر دھیان گئے

ہم چمن میں گئے تھے وا نہ ہوئے
نکہتِ گُل سے آشنا نہ ہوئے
سر کسو سے فرو نہیں آتا
حیف بندے ہوئے خُدا نہ ہوئے
کیسا کیسا قفس سے سر مارا
موسمِ گُل میں ہم رہا نہ ہوئے
مَیں نہ گردن کشائی جب تک میرؔ
عشق کے مجھ سے حق ادا نہ ہوئے

آنکھوں سے راہِ عشق کی ہم جوں نگہ گئے
آخر کو روتے روتے پریشاں ہو بہ گئے
اس عرصے سے گیا ہو کہیں کوئی تو کہیں
چل پھر کے لوگ یاں کے یہیں سارے رہ گئے

تعارف کیا رہا اہلِ چمن سے
ہوئی اک عمر میں اپنی رہائی
کہاں کا بیستوں فرہاد کیسا
یہ تھی سب عشق کی زور آزمائی
جفا اٹھتی وفا جو عُمر کرتی
سو کی اُس رفتنی نے بے وفائی
ہوئے ہیں دو بدِل سے میرؔ کے تنگ
پھر اس جوگی نے یاں دھونی لگائی

بات کیا آدمی کی بن آئی — آسماں سے زمین نپوائی
چرخ زن اُس کے واسطے ہے مدام — ہوگیا دن تمام رات آئی
ماہ و خورشید و ابر و باد سبھی — اُس کے خاطر ہوئے ہیں سودائی
میرؔ ناچیز مشتِ خاک اللہ — اُن نے یہ کبریا کہاں پائی

دیوانِ چہارم

۱

تجاہل، تغافل، تساہل کیا — ہوا کام مشکل توکّل کیا
نہیں تاب لاتا دلِ زار اب — بہت ہم نے صبر و تحمل کیا
زمینِ غزل ملک سی ہو گئی — یہ قطعہ تصرف میں بالکل کیا

کون لیتا تھا نام مجنوں کا — جب کہ عہدِ جنوں ہمارا تھا
ہم تو تھے محوِ دوستی اُس کے — گو کہ دشمن جہان سارا تھا
لطف سے پوچھتا تھا ہر کوئی — جب تلک لطف کچھ تمہارا تھا
عشق بازی میں کیا مزے ہیں میرؔ — آگے ہی جی اُنھوں نے ہارا تھا

زار کیا بیمار کیا اس دل نے کیا آزار کیا
داغ سے تن گلزار کیا سب آنکھوں کو خوں بار کیا
چاہا ہم نے کیا کیا تھا پر اپنا چاہا کچھ نہ ہُوا
عزّت کھوئی ذلت کھینچی عشق نے خوار و زار کیا

سادگی میری نے آہ نہ جانا جی ہی اس میں جاتا ہے
عشق کا اُس پرکار کے میں نے لوگوں میں اصرار کیا

(د)

شعر دیواں کے میرے کر کر یاد
مجنوں کہنے لگا کہ ہاں اُستاد

وحشی اب گرد باد سے ہم ہیں
عمر افسوس کیا گئی برباد

چار دیواریٔ عناصر میرؔ
خوب جاگہ ہے پر ہے بے بنیاد

(ر)

مرتے ہیں ہم تو آدم خاکی کی شان پر
اللہ رے دماغ کہ ہے آسمان پر

آفات ہیں ہیں مرغ چمن گل کے شوق سے
جو کھوں ہزار رنگ کی رہتی ہے جان پر

اس کامِ جاں کے جلوؤں کا میں ہی نہیں ہلاک
آفت عجب طرح کی ہے سارے جہان پر

شوخی تو دیکھو آپ ہی کہا آؤ بیٹھو میرؔ
پوچھا کہاں تو بولے کہ میری زبان پر

(ف)

میں آگئے نہ تھا دیدۂ پُرآب سے واقف
پلکیں نہ ہوئی تھیں یہی خوں ناب سے واقف

ہم تنگ خلائق یہ عجب ہے کہ نہیں ہیں
اس عالمِ اسباب میں اسباب سے واقف

شب آنکھیں کھلی رہتی ہیں ہم منتظروں کی
جوں دیدۂ انجم نہیں ہیں خواب سے واقف

(گ)

اس رنگ سے جو زرد زبوں زار رہیں ہم لوگ
دل کے مرضِ عشق سے بیمار رہیں ہم لوگ

کیا اپنے تئیں پستی بلندی سے جہاں کی
اک خاک برابر ہوئے ہموار رہیں ہم لوگ

جاتے ہیں چلے قافلے در قافلے اس راہ
چلنے میں تردد نہیں تیار رہیں ہم لوگ

گر پہنچی نظر میر کی ہو آنکھیں تو ٹک دیکھ　　　کیا دل زدگاں سادہ ہیں پرکار ہیں ہم لوگ

دل کے گئے بے دل کہلائے آگے دیکھئے کیا کیا ہوں
محزوں ہوویں مفتوں ہوویں مجنوں ہوویں رسوا ہوں
عشق کی رہ میں پاؤں رکھا سو بہنے دے کچھ رفتہ سے
آگے چل کر دیکھیں ہم اب گم ہوویں یا پیدا ہوں
خار و خس الجھے ہیں آپ ہی بحث انھوں سے کیا رکھیں
موج زن اپنی طبع رواں سے جب ہم جیسے دریا ہوں
ہم بھی گئے جاگہ سے اپنی شوق میں اُس ہرجائی کے
عشق کا جذبہ کام کرے تو پھر ہم دونوں یک جا ہوں

یوں ناکام رہیں گے کب تک جی میں ہے اک کام کریں
رسوا ہو کر مارے جاویں اُس کو بھی بدنام کریں
منہ کھولے تو روزِ روشن زلف بکھیرے رات ہے پھر
ان طوروں سے عاشق کیوں کر صبح کو اپنی شام کریں
خط و کتابت حرف و حکایت صفحۂ ورق میں آجاوے
دستے کے دستے کاغذ ہو جو دل کا حال ارقام کریں
شیخ پڑے محراب حرم میں پہروں دوگانہ پڑھتے ہو
سجدہ ایک اس تیغ تلے کا ان سے ہو تو سلام کریں

مَیل گدائ طبع کو اپنے کچھ بھی نہیں ہے ورنہ میرؔ
دو عالم کو مانگ کے لادیں ہم جو تنک ابرام کریں

(ہ)

چاہ میں دل پر ظلم و ستم ہے جور و جفا ہے کیا کیا کچھ
درد و الم ہے کُلفت و غم ہے رنج و بلا ہے کیا کیا کچھ
عاشق کے مرجانے کے اسباب بہت رُسوائی میں
دل بھی لگا ہے شرم و حیا ہے مہر و وفا ہے کیا کیا کچھ
عشق تنے وے کر آگ یکایک شہر تن کو پھونک دیا
دِل تو جلا ہے دماغ جلا ہے اور جلا ہے کیا کیا کچھ
دل لینے کو فریفتہ کے بہترا کچھ ہے یار کنے
غمزہ، عشوہ، چشمک، چتون، ناز و ادا ہے کیا کیا کچھ
حسرتِ وصل، اندوہِ جُدائی، خواہش کاوش، ذوق شوق
یوں تو چلا ہوں اکیلا لیکن ساتھ چلا ہے کیا کیا کچھ

(ی)

خوار پھرایا گلیوں گلیوں سر مارے دیواروں سے
کیا کیا اُن نے سُلوک کیے ہیں شہر کے عزت داروں سے
شور کیا جو مَیں نے شبانگہ بیتابی سے دل کی بہت
کہنے لگا جی تنگ آیا اِن مہر و وفا کے ماروں سے
خستہ ہو اپنا کیسا ہی کوئی پھر بھی گلے سے لگاتے ہیں

وحشت ایک تمہیں کو دیکھی اپنے سینہ دگاروں سے
کوہ کن و مجنوں یہ دونوں دشت و کوہ میں سر ماریں
شوق نہیں ملنے کا ہم کو میرؔ ایسے آواروں سے

کرتے نہیں ہیں دل خوں اس رنگ سے کسو کا ۔۔۔ ہم دل شدوں کی اُن نے کیا خوب دلبری کی
رفتارِ ناز کا ہے پامال ایک عالم ۔۔۔ اُس خود نما نے کیسی خوش درائی خودسری کی
گزرے لبانِ صرصر عالم سے بے تامّل ۔۔۔ افسوس میرؔ تم نے کیا سیر سرسری کی

چلو چمن میں جو دل کھلے ٹک بہم غمِ دل کہا کریں گے
طیورہی سے بکا کریں گے، گلوں کے آگے بکا کریں گے
قرارِ دل سے گیا ہے اب کی کہ رنگ کے گھر ہیں تئے مٹے گلوں
بہار آئی جو اپنے جیتے تو سیر کرنے چلا کریں گے
ہلاک ہونا مقرری ہے مرض سے دل کے پہ تم کڑھو ہو
مزاجِ صاحب اگر اُدھر ہے تو ہم بھی اپنی دوا کریں گے
اگر وہ رشکِ بہار سمجھے کہ رنگ اپنا بھی ہے اب ایسا
ورق خزاں میں جو زرد ہوں گے غمِ دل اُس پہ لکھا کریں گے
غمِ محبت میں میرؔ ہم کو ہمیشہ جلنا ہمیشہ مرنا
صعوبت ایسی دماغ رفتہ کہاں تلک ہم وفا کریں گے

چلتے ہو تو چمن کو چلیے کہتے ہیں کہ بہاراں ہے
پات ہرے ہیں پھول کھلے ہیں کم کم باد و باراں ہے

رنگ ہوا سے یوں ٹپکے ہے جیسے شراب چُواتے ہیں
آگے ہو میخانے کے نکلو عہدِ بادہ گُساراں ہے

عشق کے میداں داروں میں بھی مرنے کا ہے وصف بہت
یعنی مصیبت ایسی اُٹھانا کارِ کارگُزاراں ہے

دل ہے داغ جگر ہے ٹکڑے آنسو سارے خون ہوئے
لوہو پانی ایک کرے یہ عشقِ لالہ عذاراں ہے

کوہکن و مجنوں کی خاطر دشت و کوہ میں ہم نہ گئے
عشق میں ہم کو میرؔ نہایت پاسِ عزت داراں ہے

موسم ہے نکلے شاخوں سے پتے ہرے ہرے	پودے چمن میں پھولوں سے دیکھے بھرے بھرے
آگے کسو کے کیا کریں دستِ طمع دراز	وہ ہاتھ سو گیا ہے سرہانے دھرے دھرے
کیا سمجھے اس کے رتبۂ عالی کو اہلِ خاک	پھرتے ہیں جوں سپہر بہت ہم ورے ورے
گلشن میں آگ لگ رہی تھی رنگِ گل سے میرؔ	بلبل پکاری دیکھ کے صاحب پرے پرے

عشق میں کھوئے جاؤگے تو بات کی تہ بھی پاؤگے
قدر ہماری کچھ جانوگے دل کو کہیں جو لگاؤگے

صبر کہاں بیتابیِ دل سے چین کہاں بے خوابی سے

سو سو بار گلی میں تکتے گھر سے باہر آؤ گے
شوقِ کمال کو پہنچا تو نہیں خط و کتابت ِحرف و سخن
قاصد کے محتاج نہ ہوگے آپ ہی دوڑے جاؤ گے
چاہ کیے درویش ہوئے تو آب و خورش کی فکر نہیں
لوہو پیوگے اپنا ہر دم غم و غصہ ہی کھاؤ گے
رنگ محبت کے ہیں کتنے کوئی تمہیں خوش آوے گا
خون کروگے یا دل کو یا داغ جگر پہ جلاؤ گے
رہتے ہیں مبہوتِ الفت ہیں گم گشتہ کلفت ہیں
بھولے بھولے آپ ہی پھروگے کس کو راہ بتاؤ گے
اشک تو پانی سے ہیں لیکن جلتے جلتے آویں گے
دل کی لگی حیران ہیں صاحب کس ڈھب مل کے بجھاؤ گے
چاہت میر کبھی کرتے ہیں رنج و تعب میں رہتے ہیں
تم جو ابھی بیتاب ہو ایسے جی سے ہاتھ اٹھاؤ گے

فرہاد و قیس گزرے اب شور ہے ہمارا
ہر کوئی اپنی نوبت دو دن بجا گیا ہے
رسوا خراب و غم کش دل باختہ محبت
عاشق کو تیرے غم میں کیا کیا کہا گیا ہے
اے میر شعر کہنا کیا ہے کمالِ انساں
یہ بھی خیال سا کچھ خاطر میں آ گیا ہے
شاعر نہیں جو دیکھا تو تو ہے کوئی ساحر
دو چار شعر پڑھ کر سب کو رجھا گیا ہے

صبر کیا جاتا نہیں ہم سے ضعف بھی ہے بیتابی ہے
سہل نہیں ہے جی کا ڈہنا کیسی خانہ خرابی ہے
آگے ایسا نکھرا نکھرا کاہے کو میں پھرتا تھا
جب سے آنکھ لگی اُس مہ سے رنگ مرا مہتابی ہے
شہرِ حُسن عجب بستی ہے ڈھونڈے پیدا مہر نہیں
ہے تو متاعِ گراں قیمت پر اس کی بلا نایابی ہے

دل کی بات کہی نہیں جاتی چُپکے رہنا ٹھانا ہے
حال اگر ہے ایسا ہی تو جی سے جانا جانا ہے
دل جو رہے تو پانوں کو بھی دامن میں ہم کھینچ رکھیں
صبح سے لے کر سانجھ تلک اودھر ہی آنا جانا ہے
سُرخ کبھو آنسو ہیں ہوتے زرد کبھو ہے مُنھ میرا
کیا کیا رنگ محبت کے ہیں یہ بھی ایک زمانا ہے
فرصت ہے یاں کم رہنے کی بات نہیں کچھ کہنے کی
آنکھیں کھول کے کان جو کھولو بزمِ جہاں افسانا ہے
آنکھوں کی یہ مردم داری دل کو کسو دلبر سے ہے
طرزِ نگہ طراری ساری میرؔ تمہیں پہچانا ہے

عشق کیا سو باتیں بنائیں یعنی شعر شعار رہوا

بیتیں جو وے مشہور ہوئیں تو شہروں شہروں رسوا تھے

اب کی وصال قرار دیا ہے ہجر ہی کی سی حالت میں

ایک سمے میں دل بے جا تھا تو بھی ہم وے یک جا تھے

کیا ہوتا جو پاس اپنے اے میر کبھو وے آ جاتے

عاشق تھے، درویش تھے آخر بیکس بھی تھے تنہا تھے

رنج کی اُس کے جو خبر گزرے — رفتہ وا رفتہ اُس کا مر گزرے

ایک پل بھی نہ اُس نے آنسو پوچھے — روتے مجھ کو پہر پہر گزرے

راہِ جاناں سے ہے گزر مشکل — جان ہی سے کوئی مگر گزرے

سر کا جانا ہی ہر قدم ہے میر — کیا کوئی اس کی راہ پر گزرے

خالی ہاتھ سیہ رو ایسے کاہے کو تھے گریہ کُناں

جن روزوں درویش ہوئے تھے پاس ہمارے دولت تھی

دیوانِ پنجم

۱

دور بہت بھاگو ہو ہم سے سیکھے طریق غزالوں کا
وحشت کرنا شیوہ ہے کچھ اچھی آنکھوں والوں کا
سرو لب جو لالہ و گل نسرین و سمن ہیں شگوفہ ہے
دیکھو جدھر اک باغ لگا ہے اپنے رنگیں خیالوں کا
پہلے تدارک کچھ ہوتا نفع بھی ہوتا سو تو میرؔ
کام ہو آخر عشق میں اس کے بیماروں بد حالوں کا

سخن مشتاق ہے عالم ہمارا — غنیمت ہے جہاں میں دم ہمارا
رہے ہم عالم مستی میں اکثر — رہا کچھ اور ہی عالم ہمارا
بہت ہی دور ہم سے بھاگتے ہو — کرو ہو پاس کچھ تو کم ہمارا
رکھے رہتے ہیں دل پر ہاتھ اے میرؔ — یہیں شاید کہ ہے سب غم ہمارا

کیا پوچھو ہو کیا کہیے میاں دل نے بھی کیا کام کیا

عشق کیا ناکام رہا آخر کو کام تمام کیا
کہنے کی بھی لکھنے کی بھی ہم تو قسم کھائے بیٹھے تھے
آخر دل کی بیتابی سے خط بھیجا پیغام کیا
عشق کی تہمت جب تھی ہوئی تھی کاہے کو ایسی شہرت تھی
شہر میں اب رُسوا ہیں یعنی بدنامی نے نام کیا
جیسے کوئی جہاں سے جاوے رخصت اس حسرت سے ہوئے
اس کوچے سے نکل کر ہم نے رُو بہ قفا ہر گام کیا
میرؔ جو اُن نے مُنہ کو ادھر کر ہم سے کوئی بات کہی
لُطف کیا احسان کیا انعام کیا اکرام کیا

ہر ورق ہر صفحے میں اک شعر شور انگیز ہے — عرصۂ محشر ہے عرصہ میرے بھی دیوان کا
کیا کہوں سارا زمانہ کشتہ و مُردہ ہے میرؔ — اُس کے اِک انداز کا اک ناز کا اِک آن کا

عشق ہمارے خیال پڑا ہے خواب گیا آرام گیا
جی کا جانا ٹھہر رہا ہے صبح گیا یا شام گیا
عشق کیا سو دیں گیا، ایمان گیا، اسلام گیا
دِل نے ایسا کام کیا کچھ جس سے میں ناکام گیا
کس کس اپنی کل کو روئے ہجراں میں بے کل اُس کا
خواب گئی ہے، تاب گئی ہے، چین گیا، آرام گیا

آیا یاں سے جانا ہے تو جی کا چھپانا کیا حاصل
آج گیا یا کل جاوے گا صبح گیا یا شام گیا
ہائے جوانی کیا کیا کہیئے شور سروں میں رکھتے تھے
اب کیا ہے وہ عہد گیا وہ موسم وہ ہنگام گیا

پہلو سے اُٹھ گیا ہے وہ نازنیں ہمارا
جز درد اب نہیں ہے پہلونشیں ہمارا
ہوں کیوں نہ سبز اپنے حرفِ غزل کے ہیہ
دے زرع سیر حاصل قطعِ زمیں ہمارا
کیسا کیا جگر خوں آزار کیسے کھینچے
آساں نہیں ہوا دل اندوگیں ہمارا
حرف و سخن تھے اپنے یاد استاں جہاں میں
مذکور بھی نہیں ہے یا اب کہیں ہمارا

آج ہمارا دل تڑپے ہے کوئی اُدھر سے آوے گا
یا کہ نوشتہ اُن ہاتھوں کا قاصد ہم تک لاوے گا
رنج بہت کھینچے تھے ہم نے طاقت جی کی تمام ہوئی
اپنے کئے پر یاد رہے یہ وہ بھی بہت پچھتاوے گا
آنکھیں موندے یہ دلبر جو سوتے رہیں سو بہتر ہے
چشمک کرتا ایک اُٹھوں کا سو سو فتنے جگاوے گا
چتون بے ڈھب آنکھیں بھری ہیں پلکوں سے بھی نظر چھوٹی
عشق ابھی کیا جانیئے ہم کو کیا کیا میر دکھاوے گا

بعد ہمارے اس فن کا جو کوئی ماہر ہووے گا
درد آگیں انداز کی باتیں اکثر پڑھ پڑھ رووے گا

چشم تماشا وا ہووے تو دیکھا بھالی غنیمت ہے
مت موندے آنکھوں کو غافل دیر تلک پھر سووے گا

جُست و جو بھی اُس کی کرے جب کا نشان کچھ پیدا ہو
پانا اس کا میر ہے مشکل جی تو یوں ہی کھووے گا

بزم کی عیشِ شب کا یاں دن ہوتے ہی یہ رنگ ہوا
شمع کی جاگہ دور تنک تھا خاکستر پروانا تھا

طُرفہ خیال کیا کرتا تھا عشق و جنوں میں روز و شب
روتے روتے ہنسنے لگا یہ میر عجب دیوانا تھا

دل خوں ہوا تھا یکسر پانی ہوا جگر سب
خوں بستہ رہتیاں تھیں پلکیں سو اب ہیں تر سب

یارب کدھر گئے وے جو آدمی روش تھے
اوجڑ دکھائی دے ہیں شہر و دہ و نگر سب

حرف و سخن سے مطلق یاں گفتگو نہیں ہے
پیادے سوار ہم کو آئے نظر نفر سب

عالم کے لوگوں کا ہے تصویر کا سا عالم
ظاہر کھلی ہیں آنکھیں لیکن ہیں بے خبر سب

میر اس خرابے میں کیا آباد ہووے کوئی
دیوار و در گرے ہیں ویراں پڑے ہیں گھر سب

سن کے حال کسو کے دل کا رونا ہی مجھ کو آتا تھا

یعنی کبھو جو کڑھتا تھا ئیں وہ رونا ہر دم ہے اب
زردیٔ چہرہ تن کی نزاری بیماری پھر چاہت ہے
دل میں غم ہے مژگاں نم ہیں حال بہت درہم ہے اب
دیکھیں دن کٹتے ہیں کیونکر راتیں کیونکر گذرتی ہیں
بیتابی ہے زیادہ زیادہ صبر بہت کم کم ہے اب
عشق ہمارا آہ نہ پوچھو کیا کیا رنگ بدلتا ہے
خون ہوا دل داغ ہوا پھر درد ہوا پھر غم ہے اب
جلنے والو پھر ملیے گا ہے وہ عالم دیگر میں
میر فقیر کو سُکر ہے یعنی مستی کا عالم ہے اب

ت

زرد ہیں چہرے سُوکھ گئے ہیں یعنی ہیں بیمار بہت
عشق کی گرمی دل کو پہنچی کہتے ہیں آزار بہت
نالہ و زاری سے عاشق کے کیا ابر بہاری طرف ہوگا
دِل ہے نالاں حد سے زیادہ آنکھیں ہیں خونبار بہت
ارض و سما کی پستی بلندی اب تو ہم کو برابر ہے
یعنی نشیب و فراز جو دیکھے طبع ہوئی ہموار بہت
کم ہی ہمیں امید بہی کی اتنی نزاری پر اس کے
پچھلے دِنوں دیکھا تھا ہم نے عاشق تھے بیمار بہت

چ

آج ہمیں بدحالی سی ہے حال نہیں ہے جان کے بیچ
کیا عاشق ہونے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے جہان کے بیچ

پایہ اس کی شہادت کا ہے عرشِ عظیم سے بالا تر
جو مظلومِ عشق ہوا ہے بڑھ کر ٹک میدان کے بیچ

وعدے کرو ہو برسوں کے تم دم کا بھروسا ہم کو نہیں
کچھ کچھ ہو جاتا ہے یاں اک پل میں اک اک آن کے بیچ

بندے خدائے پاک کے ہم جو میرؔ نہیں تو زیرِ فلک
پھر یہ تقدس آیا کہاں سے مُشتِ خاکِ انسان کے بیچ

ر

ترچھی نگاہیں کیا کرتے ہو دم بھر کے یاں آنے پر
ایدھر دیکھو ہم نے نہیں کی خم ابرُو سرجانے پر

زور ہوا ہے چل صوفی ٹک تو بھی رباطِ کہنہ سے
ابرِ قبلہ بڑھتا بڑھتا آیا ہے مے خانے پر

نادیدہ ہیں نام خُدا کے ایسے جیسے قحط زدہ
دوڑتی ہیں کیا آنکھیں اپنی سبحہ کے دانے دانے پر

حالِ پریشاں سُن مجنوں کیا جلتا ہے جی اپنا
عاشق ہم بھی میرؔ رہے ہیں اس ڈھب کے دیوانے پر

کہتے ہیں راہ پائی زاہد نے اس گلی کی
روتا کہیں نہ آوے ایمان و دیں کو کھو کر
ہے نظم کا سلیقہ ہر چند سب کو لیکن
جب جانیں کوئی لاوے یوں موتی سے پرو کر
کس کس ادا سے فتنے کرتے ہیں قصد اُدھر کا
جب بے دماغ سے تم اٹھ بیٹھتے ہو سو کر
احوال میر جی کا مطلق گیا نہ سمجھا
کچھ زیرِ لب کہا بھی سو دیر دیر رُو کر

ابرِ سیہ قبلے سے اُٹھ کر آیا ہے مے خانے پر
بادہ کشوں کا جھرمٹ ہی کچھ شیشے پر پیمانے پر
رنگ ہوا سے ٹپکنے لگا ہے سبزے میں کوئی پھول کھلا
یعنی چشمک گل کرتا ہے فصلِ بہار کے آنے پر
شورِ جنوں ہے جوانوں کے سر میں پاؤں میں زنجیریں ہیں
سنگِ زناں لڑکے پھرتے ہیں ہر ہر سو دیوانے پر
بے تابانہ شمع پر آیا گرد پھرا پھر جل ہی گیا
اپنا جی بھی حد سے زیادہ رات جلا پروانے پر

(ن)

پیری ہے اب تو کہئے سو کیا کہئے ہم نشیں! کس رنج و غم میں گزری ہیں اپنی جوانیاں

سُنتا نہیں ہے شعر بھی وہ حرفِ ناشنو — دل ہی میں خوں ہوا کیں مری نکتہ دانیاں
مجلس میں تو خفیف ہوئے ان کے واسطے — پھر اور رہ سے اُٹھتی نہیں سرگرانیاں
عالم کے ساتھ جائیں چلے کس طرح نہ ہم — عالم تو کاروان ہے ہم کاروانیاں
سررفتہ سُن نہ میر کا گر قصدِ خواب ہے — نیندیں اُچٹتیاں ہیں سُنے یہ کہانیاں

منہ کیسے اودھر زرد ہوئے جاتے ہیں ڈر سے سُبکساراں
کیونکہ ہیں گے اس رستے میں ہم سے آہ گراں باراں
کی ہے عمارت دل کی جنھوں نے اُن کی بنا کچھ رکھی رہی
اور تو خانہ خراب ہی دیکھے اس بستی کے معماراں
مے خانے میں اس عالم کے لغزش پرستوں کی نہ جبا
شُکر میں اکثر دیکھے ہم نے بڑے بڑے یاں ہشیاراں
عشق میں ہم سے تم سے کہیں تو چھپ جاویں غم کس کو ہے
مارے گئے ہیں اس میداں میں کیا دل والے جگرداراں

و

رہنے سے مرے پاس کے بدنام ہوئے تم
اب جا کے رہو واں کہیں رُسوا نہ جہاں ہو
کچھ حال کہیں اپنا نہیں بے خودی تجھ کو
غش آتا ہے لوگوں کو یہ افسانہ جہاں ہو
اُن اُجڑی ہوئی بستیوں میں دِل نہیں لگتا

ہے جی میں وہیں جا بسیں ویرانہ جہاں ہو
وحشت ہے خردمندوں کی صحبت سے مجھے میرؔ
اب جا رہوں گا واں کوئی دیوانہ جہاں ہو

موسم گل آیا ہے یارو کچھ میری تدبیر کرو
یعنی سایۂ سروِ گُل میں اب مجھ کو زنجیر کرو
پھیر دیئے ہیں دل لوگوں کے مالک نے کچھ میری طرف
تم بھی ٹک لے آہ و نالہ قلبوں میں تاثیر کرو
آگے ہی آزردہ ہیں ہم دل ہیں شکستہ ہمارے سب
حرف رنجش بیچ میں لاکر اور نہ اب دلگیر کرو
کیا ہو محوِ عمارت منعم اے معمارِ خرابی ہے
بن آوے تو گھر ویراں درویشوں کے تعمیر کرو
شعر کئے موزوں تو ایسے جن سے خوش ہیں صاحب دل
روویں کڑھیں جو یاد کریں اب ایسا تم کچھ میرؔ کرو

دُرج گوہر مال نہیں کچھ دیں در بستہ مصر اگر
تو بھی ایسی قیمت پر تم آگے ہمارے سستے ہو
رستے راہ میں دیکھ لیا ہے بستی میں سے نکلے تمہیں
کیا جانیں ہم روز و شب تم کیدھر رہتے بستے ہو

ی

جوں ابر بے کسانہ روتے اُٹھے ہیں گھر سے — برسے ہے عشق اپنے دیوار اور در سے

جمہور راہ اُس کی دیکھا کرے ہے اکثر — محفوظ رکھ الٰہی اس کو نظر گزر سے

گلشن سے لے قفس تک آواز ایک سی ہے — کیا طائرِ گلستاں ہیں نالہ کش اثر سے

یہ عاشقی ہے کیسی ایسے جیوگے کب تک — ترکِ وفا کرو ہو مرنے کے میرؔ ڈر سے

پتا پتا بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے

جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

آگے اس متکبر کے ہم خدا خدا کیا کرتے ہیں

کب موجود خدا کو وہ مغرور خود آرا جانے ہے

عاشق سا تو سادہ کوئی اور نہ ہوگا دنیا میں

جی کے زیاں کو عشق میں اس کے اپنا وارا جانے ہے

چارہ گری بیماری دل کی رسم شہرِ حسن نہیں

ورنہ دلبر ناداں بھی اس درد کا چارا جانے ہے

مہر و وفا و لطف و عنایت ایک سے واقف ان میں نہیں

اور تو سب کچھ طنز و کنایہ رمز و اشارا جانے ہے

عالم عالم عشق و جنوں ہے دنیا دنیا تہمت ہے

دریا دریا روتا ہوں میں صحرا صحرا وحشت ہے

ہم تو عشق میں ناکس ٹھہرے کوئی نہ ادھر دیکھے گا
آنکھ اُٹھا کر وہ دیکھے تو یہ بھی اُس کی مروت ہے

کوئی دم رونق مجلس کی اور بھی ہے اس دم کے ساتھ
یعنی چراغِ صبح سے ہیں ہم دم بھی اپنا غنیمت ہے

خاک کو آدم کرکے اُٹھایا جس کے دستِ قدرت نے
قدر نہیں کچھ اس بندے کی یہ بھی خدا کی قدرت ہے

کیا دلکش ہے بزم جہاں کی جاتے یہاں جس کو دیکھو
وہ غم دیدہ رنج کشیدہ آہ سراپا حسرت ہے

عہدِ جنوں ہے موسم گل کا اور شگوفہ لایا ہے
ابر بہاری وادی سے اُٹھ کر آبادی پر آیا ہے

دکھن، اُتر، پورب، پچھم ہنگامہ ہے سب جاگہ
اُدھم میرے حرف و سخن نے چاروں اور مچایا ہے

ہو کے فقیر تو واں بیٹھے ہیں رہتے ہیں اشراف جہاں
ہم نے توکل بچت کیا ہے نام خدا سرمایا ہے

میر غریب سے کیا ہے معارض گوشے میں اس وادی کے
ایک دیا سا بجھتا اُن نے داغِ جگر پہ جلایا ہے

دل کی لاگ بری ہوتی ہے رہ نہ سکے ٹک جائے بھی

آئے بیٹھے اُٹھ بھی گئے بیتاب ہُئے پھر آئے بھی

رنگ نہیں ہے منہ پہ کسی کے بادِ خزاں سے گلستاں میں

برگ و بار گرے بکھرے ہیں گل غنچے مرجھائے بھی

عشق میں اُس کے جان مری مشتاق پھرے گی بھٹکی ہوئی

شوق اگر ہے ایسا ہی تو چین کہاں مر جائے بھی

تاجر ترک فقیر ہوئے اب شاعر عالم کامل ہیں

پیش گئی کچھ میرؔ نہ اپنے سوانگ بہت سے لائے بھی

کیسی سعی و کشش کوشش سے کعبے گئے بتخانے سے

اس گھر میں کوئی بھی نہ تھا شرمندہ ہوئے ہم جانے سے

دامن پر فانوس کے تھا کچھ یوں ہی نشاں خاکستر کا

شوق کی میں جو نہایت پوچھی جاں جلے پروانے سے

برسوں میں پہچان ہوئی تھی سو تم صورت بھول گئے

یہ بھی شرارت یاد رہے گی ہم کو نہ جانا جانے سے

میرؔ کی تیزی کیا سلجھے گی حرف و سخن میں گنجلک ہے

کوئی بھی عاقل اُلجھ پڑے ہے ناصح ایسے دِوانے سے

عشق ہے فقر ہے جدائی ہے ان بلاؤں سے کب رہائی ہے

کچھ تعجب نہیں خدائی ہے اس صنائع کا اس بدائع کا

دیوانِ ششم

۱

باتیں ہماری یاد رہیں پھر باتیں ایسی نہ سُنیے گا
پڑھتے کسو کو سُنیے گا تو دیر تلک سر دُھنیے گا
سعی و تلاش بہت سی رہیگی اس انداز کے کہنے کی
صحبت میں علما فضلا کی جاکر پڑھیے گُنیے گا
گرم اشعار میرؔ درونہ داغوں سے یہ بھر دیں گے
زرد رو شہر میں پھریے گا گلیوں میں نے گُل چُنیے گا

قدر جانو کچھ ہماری ورنہ پچھتاؤ گے تم
پھر نہیں ملنے کا تم کو کوئی ہم سا آشنا
باغ کو بے لالہ و گل دیکھ کہتے تھے طیور
جھڑ گئے پت جھڑ میں اب ہائے کیا کیا آشنا
تھا جنوں کا لطف مجنوں سے سو دنیا سے گیا
مغفرت ہو اس کو وحشی ہم سے بھی تھا آشنا
اب جو ہاتھ آئے ہیں ہم مت مفت کھو دیکھیو ہمیں
پھر نہ ہوگا تم کو ایسا کوئی پیدا آشنا

سخن مشتاق ہے عالم ہمارا
بہت عالم کرے گا غم ہمارا
پڑھیں گے شعر رو رو لوگ بیٹھے
رہے گا دیر تک ماتم ہمارا

نہیں ہے مرجع آدم اگر خاک　　کدھر جاتا ہے قدِ خم ہمارا

ت

دعویٰ عاشق بیچارے کا کون سُنے گا محشر میں
خیلِ ملائک واں بھی ہوں گے اُس کے خاطردار بہت
خشکی لب کی زردی رخ کی نمناکی دو آنکھوں کی
جو دیکھے ہے کہے ہے یہ اُن نے کھینچا ہے آزار بہت
پیش گئی نہیں کچھ چاہت میں کافر و مسلم دونوں کی
سیکڑوں سبحے کھینچے گئے اور ٹوٹے ہیں زنار بہت
میر دعا کر حق میں میرے تو بھی فقیر ہے مدت سے
اب جو کبھو دیکھوں اُس کو تو مجھ کو نہ آوے پیار بہت

ن

دِل گئے آفت آئی جانوں پر　　یہ فسانہ رہا زبانوں پر
گرچہ انسان ہیں زمیں سے ملے　　ہیں دماغ اُن کے آسمانوں پر
عرش و دل دونوں کا ہے پایہ بلند　　سیر رہتی ہے ان مکانوں پر
قصے دنیا میں میر بہت سُنے　　نہ رکھو گوش ان فسانوں پر

ک

عہد و عید و حشر قیامت ہے دیکھیے　　جیتے رہیں گے طالب دیدار کب تلک
دِل کا جگر کا لوہو تو غم نے سکھا دیا　　آنکھیں رہیں گی دیکھیے خوں بار کب تلک
نسبت بہت گناہوں کی کرتا ہے اسعرف　　بے جرم ہم رہیں گے گنہ گار کب تلک

دیوار و در بڑے تھے جہاں واں نشاں نہیں — یاں خانوادوں کے رہیں آثار کب تلک
صیاد اسیر کر کے جسے اُٹھ گیا ہو میر — وہ دام کی شکن میں گرفتار کب تلک

ل

طریقِ عشق میں ہے رہنما دل — پیمبر دل ہے قبلہ دل خُدا دل
رکا اتنا خفا اتنا ہوا تھا — کہ آخر خون ہو ہو کر بہا دل
گئے وحشت سے باغ و راغ میں بھی — کہیں ٹھہرا نہ دُنیا سے اُٹھا دل
ہوا پژمردہ و بے صبر و بے تاب — کریگا اِس طرح کب تک وفا دل

م

عشق کیا ہے اُس گل کا یا آفت لائے سر پر ہم
جھانکتے اُس کو ساتھ صبا کے صبح پھریں ہیں گھر گھر ہم
روز و شب کو اپنی یارب کیونکہ کریں گے روز و شب
ہاتھ رکھے رہتے ہیں دل پر بے تابی میں اکثر ہم
اَب تو ہماری طرف سے اتنا دِل کو پتھر مت کر لو
سختی سے ایام کی اب تک جیتے رہے ہیں مر مر ہم
شعلہ اک اُٹھا تھا دِل سے آہِ عالم سوز کا میر
ڈھیری ہوئی ہے خاکستر کی جس کی لپٹ میں جل کر ہم

وے ہم ہیں جن کو کہیئے آزار دیدہ مردم — اُلفت گزیدہ مردم کلفت کشیدہ مردم
ہے اپنا جی ہی درہم تس پر ہے عشق کا غم — رہتے ہیں دم بخود ہم آفت رسیدہ مردم

وہ دیکھے ہم کو آکر جن نے نہ دیکھے ہوویں — آزردہ دل شکستہ خاطر کبیدہ مردم
مت خاک عاشقاں پر پھر آب زندگی سا — جاگیں کہیں نہ سوتے یہ آرمیدہ مردم

ن

بہار آئی مزاجوں کی سبھی تدبیر کرتے ہیں — جوانوں کو انھیں ایام میں زنجیر کرتے ہیں
در و دیوار افتادہ کو بھی کاش اک نظر دیکھیں — عمارت ساز مردم گھر جو اب تعمیر کرتے ہیں

اہل چمن سے کیونکر اپنی ہو روشناسی — برسوں اسیر رہ کر اب ہم رہا ہوئے ہیں
خاموش اُس کے در پر ہو کر فقیر بیٹھے — یعنی کہ عاشقی میں ہم بے نوا ہوئے ہیں
اظہار کم فراغی ہر دم کی بے دماغی — ان روزوں میرؔ صاحب کچھ میرزا ہوئے ہیں

دل کو جانا تھا گیا رہ گیا ہے افسانہ — روز و شب ہم بھی کہانی سی کہا کرتے ہیں
حوصلہ چاہیے جو عشق کے آزار کھنچیں — ہر ستم ظلم پہ ہم صبر کیا کرتے ہیں

گر روزگار ہے یہی ہجران یار میں — تو کیا رہیں گے جیتے ہم اس روزگار میں
مربوط کیسے کیسے کہے ریختے ولے — سمجھا نہ کوئی میری زباں اس دیار میں
منہ چاہیے جو کوئی کسو سے حساب لے — ناکس کی گفتگو نہیں روز شمار میں
گنتی کے لوگوں کی وہاں صف ہووے گی کھڑی — تو میرؔ کس شمار میں ہے کس قطار میں

و

آب دل خزاں میں تھا جی کی کسک کے ساتھ — جانا ہی تھا ہمیں بھی بہار چمن کے ساتھ

کبتک خراب شہر میں اُس کے پھرا کریں اب جاویں یاں سے کوئی غریب الوطن کے ساتھ
کیا جانیں لوگ عشق کا راز و نیاز میر اک بات اُس سے ہوگئی دو دو بچن کے ساتھ

دیکھیں عاشق کا جی بھی ہے کہ نہیں تنگ ہے جانِ ناصبور سے وہ
خوش ہیں دیوانگی میر سے سب کیا جنوں کر گیا شعور سے وہ

ی

کہتے ہیں مرنے والے یاں سے گئے سب یہیں رہ گئے کہاں سے گئے
اس گلی سے جو اُٹھ گئے بے صبر میر گویا کہ وے جہاں سے گئے

عشق میں ہم نے جاں کنی کی ہے کیا محبت نے دشمنی کی ہے
تکیہ ویراں فقیر کا بھی نہ ہو یاں خرابی بہت غنی کی ہے
قافلہ لُٹ گیا جو آنسو کا عشق نے میر رہزنی کی ہے

بال و پر بھی گئے بہار کے ساتھ اب توقع نہیں رہائی کی
وصل کے دن کو کار جاں نہ کھنچا شب نہ آخر ہوئی جدائی کی
کوہکن کیا پہاڑ توڑے گا عشق نے زور آزمائی کی
اِک نگہ میں ہزار دل مارے ساحری کی کہ دِلربائی کی
میر کی بندگی میں جا بارے سیر سی ہو گئی خدائی کی

گل نے بہت کہا کہ چمن سے نہ جائیے
گلگشت کو جو آئیے آنکھوں پہ آئیے

میں بے دماغ کر کے تغافل چلا گیا
وہ دل کہاں کہ ناز کسو کے اُٹھائیے

صحبت عجب طرح کی پڑی اتفاق ہائے
کھو بیٹھیے جو آپ کو تو اُس کو پائیے

خاطر ہی کے علاقے کی سب ہیں خرابیاں
اپنا ہو بس تو دل نہ کسو سے لگائیے

جانِ غیور پر ہے ستم سا ستم کہ میر
بگڑا جنھوں سے چاہیے اُن سے بنائیے

★

دل میں مسودے تھے بہت پر حضورِ یار
نکلا نہ ایک حرف بھی میری زبان سے

ٹک دل سے آؤ آنکھوں میں ہو دید کی جگہ
بہتر نہیں مکان کوئی اس مکان سے

اوّل زمینیوں میں ہو مائل مری طرف
جو حادثہ نزول کرے آسمان سے

★

یارب رکھیں گے پنبہ و مرہم کہاں کہاں
سوزِ دروں سے ہائے بدن داغ داغ ہے

گھر گھر چھپے ہیں جھانکتے ہم صبح جوں نسیم!
پردے میں کوئی ہے کہ یہ اس کا سُراغ ہے

★

ہم رو رو کے دردِ دلِ دیوانہ کہیں گے
جی میں ہے کہو حالِ غریبانہ کہیں گے

سودائی و رسوا و شکستہ دل و خستہ
اب لوگ ہمیں عشق میں کیا کیا نہ کہیں گے

ہوں دربدر و خاک بسر چاک گریباں
اِس طور سے کیونکر مجھے رسوا نہ کہیں گے

ویرانے کو مدت کے کوئی کیا کرے تعمیر
اُجڑی ہوئی آبادی کو ویرانہ کہیں گے

موقوف غمِ میر کہ شب ہو چکی ہمدم
کل رات کو پھر باقی یہ افسانہ کہیں گے

★

آؤ کبھو تو پاس ہمارے بھی ناز سے — کرنا سلوک خوب ہے اہلِ نیاز سے
پھرتے ہو کیا درختوں کے سائے میں دور دور — کر لو موافقت کسو بے برگ و ساز سے

چرخ پر اپنا مدار دیکھیے کب تک رہے — ایسی طرح روزگار دیکھیے کب تک رہے
سہرے کہاں تک ٹک پڑیں آنسوؤں کے چہرے پر — گریہ گلے ہی کا ہار دیکھیے کب تک رہے
لب پہ مرے آن کر بارہا پھر پھر گئی — جان کو یہ اضطرار دیکھیے کب تک رہے
اُس سے تو عہد و قرار کچھ بھی نہیں درمیاں — دل ہے مرا بے قرار دیکھیے کب تک رہے
روئے سخن سب کا ہے میری غزل کی طرف — شعر ہے میرا شعار دیکھیے کب تک رہے

گیسو و رخسارِ یار آنکھوں ہی میں پھرتے ہیں
میرؔ یہ لیل و نہار دیکھیے کب تک رہے

مثنویات

شعلۂ عشق

محبت نے ظلمت سے کاڑھا ہے نور — نہ ہوتی محبت، نہ ہوتا ظہور
محبت مسبب، محبت سبب — محبت سے آتے ہیں کارِ عجب
محبت ہی اس کارخانے میں ہے — محبت سے سب کچھ زمانے میں ہے
محبت عجب خواب خوں ریز ہے — محبت بلائے دلِ آویز ہے
محبت کی ہیں کار پردازیاں — کہ عاشق سے ہوتی ہیں جانبازیاں
محبت سے ہے انتظامِ جہاں — محبت سے گردش میں ہے آسماں
محبت سے روتے گئے یار خوں — محبت سے ہو ہو گیا ہے جنوں
محبت سے آتا ہے جو کچھ کہو — محبت سے ہو جو وہ ہرگز نہ ہو
اسی آگ سے شمع کو ہے گداز — اسی کے لئے گل ہے سرگرمِ ناز
محبت سے یاروں کے ہیں رنگ زرد — دلوں میں محبت سے اُٹھتے ہیں درد
گیا قیس ناشاد اس عشق میں — کھپی جاں فرہاد اس عشق میں
ستم اس بلا کے ہی سہتے گئے — سب اس عشق کو عشق کہتے گئے
اِسی سے قیامت ہے ہر چار اور — اِسی فتنہ گر کا ہے عالم میں شور

کب اس عشق نے تازہ کاری نہ کی
کہاں خون سے غازہ کاری نہ کی

زمانے میں ایسا نہیں تازہ کار
غرض ہے یہ اعجوبۂ روزگار

آغاز قصّہ

عجب کام پٹنے میں اس سے ہوا
عجب اہلِ عالم کو جس سے ہوا

کہ واں اک جواں تھا پرسرام نام
خوش اندام و خوش قامت و خوش خرام

جوانی کے گلشن کا وہ آب و رنگ
گلستاں پہ کام اسکی خوبی سے تنگ

جدھر نکلے رنگیں ادائی کے ساتھ
چلے جائیں جی خوش نمائی کے ساتھ

رُخ اس کا کہاں اور مہ و خور کہاں
تفاوت زمین آسماں کا ہے یاں

دو لب لعل کو جن سے شرمندگی
دمِ حرف سرمایۂ زندگی

دہن کی جو تنگی نظر کیجئے
تو آگے سخن مختصر کیجئے

سراپا میں اس کے جہاں دیکھئے
وہیں روئے مقصودِ جاں دیکھئے

خراماں نکلتا وہ جس راہ سے
قیامت تھی واں نالہ و آہ سے

بہت رفتگانِ ادائے کلام
بہت مبتلائے بلائے خرام

کوئی کشتۂ شوق رفتار کا
کوئی نیم جاں ذوق دیدار کا

کوئی دست بر دل کوئی بیقرار
کوئی بے خبر کوئی بے اختیار

انھوں میں سے اک عاشق زار تھا
اُس آفت کو اس سے سروکار تھا

محبت میں تھا جذبِ کامل اُسے
مرادِ دل اپنی تھی حاصل اُسے

کہاں حسن میں تھا وفا کا یہ پاس
یہ سُنیئے کہ ہے گا خلافِ قیاس

بہت سے بہت اس کا مالوف تھا
اسی کی تسلّی سے مصروف تھا

کہ ناگہ وہ دلبر ہوا کد خدا
رہا اپنے عاشق سے چندے جدا

زن و شو سے اخلاص باہم ہوا
اُس آشفتہ سے رابطہ کم ہوا

نگاہیں بہم دِل میں کاوش کریں
سخن سے وفائیں تراوش کریں

وفا نے جو تکلیف کی ایک روز
گیا اپنے عاشق کے وہ دِل فروز

کئی دن میں جا کر جو اُس سے ملا
کیا اُس نے حد سے زیادہ گِلا

کہ اے نازنیں آہ کن نے کہا
کہ تو حال سے میرے غافل رہا

مگر سدِ رہ تھا کسو کا فریب
ملا کوئی تجھ سے بھی دشمن شکیب

کوئی زُلف زنجیر پا ہو گئی
کہ مسدودِ راہِ وفا ہو گئی

کہا اُن نے تھی کد خدائی مری
نہ تھی بے سبب یہ جُدائی مری

کہ اَب مجھ کو معذور ناچار ہوں
محبت کا میں تو گرفتار ہوں

اُسے مجھ سے ہے نسبتِ عاشقی
وہ رہتی ہے بے طاقتِ عاشقی

نکلتا ہوں گھر سے جو میں ایک آن
تو پاتا ہوں جا کر اُسے نیم جان

نہ دیکھے جو مجھ کو تو مر جاوے وہ
وہیں جی سے اپنے گزر جاوے وہ

یہ سُن کر کہا اُس دِل افگار نے
ستم کشتۂ دوریِ یار نے

کہ مجھ کو نہیں تیری باتیں قبول
یہ مکرِ زناں ہیں تو ان پر نہ بھول

جہاں میں فریب اُن کا مشہور ہے
زبانوں پہ مکر ان کا مذکور ہے

پئے امتحاں عاقبت یک نفر
مقرر ہوا تا کہ جا اُس کے گھر

کہے غرق دریا ہوا پرسرام
ہوئی زندگانی کی صبح اس کی شام

تمنّا میں تھے جس کے سب دل فگار — سو دریا کو اب ہے وہ بوس و کنار
نہ سمجھا وہ نافہم اسرارِ عشق — نہ سوچا وہ ناتجربہ کارِ عشق
کہا غرقِ دریا ہوا پرس رام — ہوا کام اس رشکِ مہ کا تمام
کہے تو کہ موجوں کو تھا انتظار — کہ دست و بغل ہو گئیں ایک بار
گیا بیٹھ پانی میں ایسا شتاب — کہ گویا لبِ آب کا تھا حباب
کنارے پہ دریا کے اک شور ہے — بحالِ خراب ایک جمہور ہے
کوئی سر پہ اس غم سے ڈالے ہے خاک — کسی نے کیا ہے گریباں کو چاک
سنا اس کی ہمسر نے جب یہ سخن — ہوا موج زن بحرِ رنج و محن
نگہ اک طرف کر کے مایوس کی — دمِ سرد کھینچا گیا ڈوب جی
وہی بے خودی رخصتِ جان تھی — وہ اک دم کی گویا کہ مہمان تھی
گری ہو کے بے جاں وہ دردمند — ہوا شور نوحے کا گھر سے بلند
ہوئی غم میں اس جملہ تن نازکے — گئی جان ہمراہ سخن ساز کے
وہ آیا جو تھا دل پریشاں گیا — کہ اس واقعے سے پشیماں گیا
خبر لے گیا اس کنے زود تر — جو تھا در پئے امتحاں بے خبر
کہ وہ رشکِ مہ امتحاں دے گئی — محبت کے ناموس کو لے گئی
گیا ہوش سن کر یہ پرس رام کا — دوانہ ہوا عشق کے کام کا
اٹھا بے خود و بے خرد بے حواس — گرا آ کے اس پیکرِ مردہ پاس
لگا کہنے اے مایۂ زندگی — مجھے منہ سے تیرے ہے شرمندگی
زمیں پر سے آخر اٹھایا اسے — لبِ آب جا کر جلایا اسے

جب آگ اس کے پیکر پہ سب چھا گئی　　محبت عجب داغ دکھلا گئی
یہ سرگرم فریاد و زاری ہوا　　لہو اُس کی آنکھوں سے جاری ہوا
جگر غم میں یک لخت خوں ہو گیا　　رُکا دل کہ آخر جنوں ہو گیا
گئے ہوش و صبر اُس کے یکبارگی　　طبیعت میں آئی اِک آوارگی
سراسیمگی سے بگولا ہوا　　پھرے اس طرح جیسے بھولا ہوا
نہ جی کو تسلّی نہ دِل کو قرار　　کفِ غم میں سر رشتۂ اختیار
ہوئی رفتہ رفتہ جو وحشت زیاد　　لگا بھاگنے سب سے وہ نامراد
کبھو جا کے صحرا سے لاویں اُسے　　کبھو روتے دریا پہ پاویں اُسے
سرِ شام اِک روز دریا گیا　　ہوئی رات واں سے نہ آیا گیا
کنارے پہ رہتا تھا ایک دُم دار　　رہا رات اُس کے یہ قُرب و جوار
کہا اس کی عورت نے اس رات کو　　نہیں تجھ سے جی چاہتا بات کو
تجھے فکر کچھ اَب ہماری نہیں　　تو جاتا نہیں شام سے اب کہیں
ترا شب کو دریا میں پڑتا تھا دام　　تو چلتا تھا بارے معیشت کا کام
تو جاتا نہیں شب کو جب روز سے　　معیشت ہے اندوہِ جاں سوز سے
نہیں طاقتِ صبر ہم کو تنک　　بہت دیر ملتا ہے نان و نمک
وہ بولا کہ میں بھی پریشان ہوں　　بہت تنگ دستی سے حیران ہوں
کہوں کیا کئی روز سے شام کو　　اُٹھاتا ہوں میں اس سبب دام کو
کہ یک شعلہ تند پُر پیچ و تاب　　فلک سے اُترتا ہے نزدیکِ آب
کوئی دم تو رہتا ہے سرگرم گشت　　کبھی سوئے دریا کبھی سوئے دشت

ٹھہرتا جو ہے پھر کنارے پہ واں
کہے ہے پری رام تو ہے کہاں

گیا وہ یہ کہہ کر سوئے آسماں
رہے ہے مجھے رات دن خوفِ جاں

سُنا حال شعلے کا صیاد سے
دھواں ایک اُٹھا جانِ ناشاد سے

گئی رات جوں توں ہوئی صبح جب
زیادہ ہوئی عشق کی تاب و تب

محبت نے کی اشتعالک کہ وہ
سراسیمہ آیا چلا اس جگہ

جہاں سے اٹھی تھی یہ آتش سلگ
پھر اس کے جگر کو لگی گھر کو لگ

تبسم کناں واں یہ اُن نے کہا
کہ کلفت میں غم کی بہت ہیں رہا

چلو سیر کشتی کو ہنگام شب
لب آب خالی کریں دل کو سب

ہوا سو ہوا یوں ہی تقدیر تھی
جہاں سوزِ الفت کی تاثیر تھی

کروں گا زمانے میں جبتک معاش
رہوں گا اسی درد سے دل خراش

مقرر کیا ہے کئی دن سے
کہ آئندہ رہیئے تری خاک رہ

جو اس میں ہے خوش تو تو ہوں میں بھی ساتھ
رہیں گے لب آب ہی آج رات

دلِ پُر کو خالی کریں کے بہم
پھریں گے ترے ساتھ خوش کوئی دم

ہوئے عاقبت سوئے دریا رواں
نہ پیدا کسو پر یہ رازِ نہاں

ہوئے ناؤ پر شام کو جب سوار
کہا اُن نے یاں ایک ہے دام دار

جہاں قفل ہو راہ دریا تو واں
کفایت ہے اس گلبدن کی زباں

اُسے ساتھ لو تو بڑی بات ہے
کہ دریا میں پھرنا ہے اور رات ہے

لیا آخر الامر ہمرہ اُسے
بٹھایا قریب اپنے یہ کہ اُسے

تنک دور چل کر کیا یہ سوال
مجھے ہے ترے حرفِ شب کا خیال

کہاں شعلۂ سرکش آتا ہے یاں | کدھر پیچ و تاب آکے کھاتا ہے یاں
یہ صیاد سے تھا ہی محوِ سراغ | جگر آتشِ شوق رکھتی تھی داغ
کہ ہوکر فروغ اِک سوئے آسماں | تڑپنے لگا جیسے آتش بجاں
کوئی دم میں دریا پہ آیا فرود | ہوا نیزہ بالا سبھوں کا نمود
لبِ آب وہ شعلۂ جاں گداز | تڑپ کر بہت با زباں دراز
پکارا کہاں ہے پرس رام تو | محبت کا ٹک دیکھ انجام تو
کہ میں جملہ تن آتشِ تیز ہوں | دِل گرم سے شعلہ انگیز ہوں
بھڑکتی ہے جب آگ دل کی مرے | لبِ آب اتروں ہوں غم میں ترے
یہ بیتاب سُن کر ہوا بے قرار | سفینے سے اُترا بصد اضطرار
ہوا ہم دم اس آتش انگیز سے | کہا اُس بلائے دِل آویز سے
کہ میں ہوں پرس رام خانہ خراب | مرا دل بھی اِس آگ سے ہے کباب
مرے بھی جگر میں یہی سوز ہے | یہی مجھ کو جلنا شب و روز ہے
محبت تری برقِ خرمن ہوئی | تری دوستی جی کی دشمن ہوئی
سخن مختصر کچھ وہ شعلہ چلا | کچھ اِک اپنی جاگہ سے یہ دل جلا
بہم گرم جوشی سے یک جا ہوئے | کہ گزری تھی مدت بھی تنہا ہوئے
وہ شعلہ رہا ایک جا مشتعل | کہے تو تسلی ہوئے جان و دل
پھر آگے کسو پر نہ پیدا ہوا | نہ جانا کہ وہ شعلہ پھر کیا ہوا
خبردار ہو اہلِ کشتی تمام | لگے کہنے باہم نہیں پرس رام
اُٹھے ڈھونڈھنے ہو کے سب ناصبور | کنارے پہ دریا کے نزدیک و دور

نہ پایا کہیں اس کو حیراں ہوئے
نہایت ہی خاطر پریشاں ہوئے

وہ صیاد بولا کہ دوں میں نشاں
گیا تھا سوئے شعلہ یہ نوجواں

یہ اور آگ دونوں ہیں ہم سخن
وہ شعلہ ہوا اس پہ آتش فگن

یہ جوشش تو یاں سے تھی مدِّ نظر
پھر آ گئے نہیں اُن کی مجھ کو خبر

گئے مضطرب حال سارے رواں
تڑپتا تھا وہ شعلہ آکر جہاں

تلاش اُس کی کی اور لے لے کے نام
پکارے بہت پر کہاں ہیں رام

محبت نے ایسا کھپایا اُسے
کہ ہرگز کنھوں نے نہ پایا اُسے

○

محبت نہ ہو کاش مخلوق کو
نہ چھوڑے یہ عاشق نہ معشوق کو

دریائے عشق

عشق ہے تازہ کار، تازہ خیال ‏ ‏ ‏ ‏ ہر جگہ اس کی اِک نئی ہے چال
دِل میں جا کر کہیں تو درد ہوا ‏ ‏ ‏ ‏ کہیں سینے میں آہ سرد ہوا
کہیں آنکھوں سے خون ہو کے بہا ‏ ‏ ‏ ‏ کہیں سر میں جنون ہو کے رہا
تھا کسی دل میں نالۂ جانکاہ ‏ ‏ ‏ ‏ ہے کِسو لب پہ ناتواں اِک آہ
تھا کسو کی پلک کی نم ناکی ‏ ‏ ‏ ‏ ہے کسو خاطروں کی غمناکی
کہیں باعث ہے دل کی تنگی کا ‏ ‏ ‏ ‏ کہیں موجب شکستہ رنگی کا
کِسو چہرے کا رنگ زرد ہوا ‏ ‏ ‏ ‏ کِسو محمل کی رہ کی گرد ہوا
خار خارِ دل عزیزاں ہے ‏ ‏ ‏ ‏ انتظارِ بلا نصیباں ہے
کہیں شیون ہے اہلِ ماتم کا ‏ ‏ ‏ ‏ کہیں نوحہ ہے جانِ پرغم کا
آرزو تھا اُمیدواروں کی ‏ ‏ ‏ ‏ دردمندی جگر فگاروں کی
کشمکش اس کی ہے ایک اعجوبہ ‏ ‏ ‏ ‏ ڈوبا عاشق تو یار بھی ڈوبا
کون محرومِ وصل یاں سے گیا ‏ ‏ ‏ ‏ کہ نہ یار اس کا پھر جہاں سے گیا
جس کو ہو اُسکی التفات نصیب ‏ ‏ ‏ ‏ ہے وہ مہمانِ چندروزہ غریب

الیسی تقریب ڈھونڈھ لاتا ہے — کہ وہ ناچار جی سے جاتا ہے

آغاز قصّۂ جاں گداز

ایک جا اک جوانِ رعنا تھا — لالہ رخسار و سروِ بالا تھا
عشق رکھتا تھا اس کی چھاتی گرم — دل وہ رکھتا تھا موم سے بھی نرم
شوق تھا اس کو صورتِ خوش سے — اُنس رکھتا تھا وضعِ دل کش سے
تھا طرح دار آپ بھی لیکن — رہ نہ سکتا تھا اچھی صورت بن
دیکھتا گر کہیں وہ چشمِ سیاہ — دِل سے بے اختیار کرتا آہ
سر میں تھا شور شوق دِل میں تھا — عشق ہی اُس کے آب و گل میں تھا
الغرض وہ جوانِ خوش اسلوب — ناشکیبا رہے تھا بے محبوب
ایک دن بے کلی سے گھبرایا — سیر کرنے کو باغ میں آیا
نہ تسلی ہوا دلِ بے تاب — نہ تھما چشمِ تر سے خونِ ناب
دیکھ گلشن کو ناامیدانہ — منہ کیا اُن نے جانبِ خانہ
ناگہ اُس کوچہ سے گزار ہوا — آفتِ تازہ سے دوچار ہوا
ایک غرفے سے ایک مہ پارہ — تھی طرف اس کے گرم نظارہ
پڑ گئی اُس پہ اِک نظر اس کی — پھر نہ آئی اُسے خبر اس کی
تھی نظر یا کہ جی کی آفت تھی — وہ نظر ہی وداعِ طاقت تھی
ہوش جاتا رہا نگاہ کے ساتھ — صبر رخصت ہوا اک آہ کے ساتھ
جھاڑ دامن کے تئیں وہ مہ پارہ — اُٹھ گئی سامنے سے یک بارہ

وہ گئی اُس کے سر بلا آئی — خاک میں مِل گئی وہ رعنائی
دل پہ کرنے لگا طپیدن ناز — رنگ چہرے سے کر چلا پرواز
ہاتھ جانے لگا گریباں تک — چاک کے پھیلے پاؤں داماں تک
طبع نے اِک جنوں کیا پیدا — اشک نے رنگِ خوں کیا پیدا
خلق اس کی ہوئی تماشائی — پر نہ وہ دیکھنے کبھو آئی
دل نہ سمجھا کہ اضطراب کیا — شوق نے کام کو خراب کیا
جو کہ سمجھے تھے اُس کو دیوانہ — رحم کرتے تھے آشنا یا نہ
عاشق اس کو کسو کا جان گئے — سب بُرا اِس ادا کو مان گئے
کیونکہ باہم معاش تھی سب کی — ایک جا بود و باش تھی سب کی
وارث اُس کے بھی بدگمان ہوئے — درپئے دشمنِ جان ہوئے
مشورت تھی کہ مار ہی ڈالیں — دفعتاً اُس بلا کے تئیں ٹالیں
پھر یہ ٹھہری کہ ہوں گے ہم بدنام — سُن کے آخر کہیں گے خاص و عام
کیا گنہ تھا کہ یہ جواں مارا — کن نے مارا اُسے کہاں مارا
کیجئے ایک ڈھب سے اس کو تنگ — تا نہ عاید ہو اپنی جانب ننگ
تہمتِ خبط رکھیے اُس کے سر — کیجئے سنگسار اُس کو پھر
دے کے دیوانہ اُس جواں کو قرار — ہو گئے سارے درپئے آزار
گرچہ ہنگامہ اس کے سر پر تھا — لیک روئے دل اس کا اودھر تھا
محو تھا اُس کے یہ خیال کے بیچ — تھا گرفتار اپنے حال کے بیچ
کاے نسیم سحر یہ اس سے کہہ — مت تغافل کر اور غافل رہ

جان دوں واسطے ترے سو تو — آنکھ اٹھا کر ادھر نہ دیکھے کبھو
رفتہ رفتہ ہوا ہوں سودائی — دور پہونچی ہے میری رسوائی
آہ جو ہمدمی سی کرتی ہے — اب تو وہ بھی کمی سی کرتی ہے
کیونکہ کہیے کہ تو نہیں آگاہ — اک قیامت بپا ہے یاں سر راہ
اور یہ ماجرا ہوا مشہور — شور رسوائیوں کا پہونچا دور
دیکھ کر اس کو بے خور و بے خواب — جانا ہر اک نے عاشق بے تاب
منہ پہ اس کے جو رنگِ خون نہیں — عشق ہے اس کو یہ جنون نہیں
عشق بے پردہ جب فسانہ ہوا — مضطرب کد خدائے خانہ ہوا
گھر میں جا بہر دفع سودائی — بیٹھ کر مشورت یہ ٹھہرائی
یاں سے یہ غیرتِ مہ تاباں — جاکے چندے کہیں رہے پنہاں
شب محافے میں اس کو کر کے سوار — ساتھ دے ایک دایۂ غدار
گھر سے باہر محافہ جو نکلا — اس جواں ہی کے پاس ہو نکلا
طپشِ دل سے ہو کے یہ آگاہ — ہو لیا ساتھ اس کے بھر کر آہ
قطرہ زن اشک سادہ راہ تمام — در پئے یار تھا یہ بے آرام
ہر قدم تھا زبان پر جاری — خواب ہے یا کہ ہے یہ بیداری
رفتہ رفتہ سخن ہوئے نالے — اڑنے لاگے جگر کے پرکالے
اضطرابِ دلی نے زور کیا — ان نے بے اختیار شور کیا
دل کے غم کو زبان پر لایا — آفتِ تازہ جان پر لایا
کاے جفا پیشۂ و تغافل کیش — اک نظر سے زیاں نہیں کچھ بیش
ناز و خوبی نے دل دیا نہ تجھے — رحم سے آشنا کیا نہ تجھے

اب تغافل نہ کر تلطف کر   حال پہ میرے ٹک تاسّف کر
گوش زد دایہ کے ہوئے یہ سخن   تھی وہ استاد کار حیلہ و فن
پاس اس کو بلا تسلّی کی   وعدۂ وصل سے تشفّی کی
کائے ستم دیدۂ غمِ دوری   ہو چکا اب زمانِ مہجوری
زارنالی نہ کر شکیبا ہو   عشق کا راز تا نہ رسوا ہو
سخت دِل تنگ تھی یہ غیرت ماہ   قطع تجھ بن نہ ہو سکی تھی راہ
گرچہ یہ حسن اتفاق سے ہے   اس کو بھی جذب اشتیاق سے ہے
تیرے آنے سے دِل کشادہ ہوا   نشۂ دوستی زیادہ ہوا
دے کر اُس کو فریب ہاتھ لیا   دِلِ عاشق کو اپنے ہاتھ لیا
لیک در پردہ اُن نے یہ ٹھانی   کیجئے اِس سے خصمیٔ جانی
یہ تو دل تفتۂ محبت تھا   سخت وارفتۂ محبت تھا
وقت نزدیک تھا جو آ پہنچا   تا سرِ آب پا بہ پا پہنچا
آب کیسا کہ بحر تھا ذخار   تند و موّاج و تیرہ و تہ دار
کشتی اِک آن کر ہوئی موجود   ہو فلک سے ہلال جیسے نمود
کی کنارے پہ لا کے ایستادہ   تھا محافہ رکوب آمادہ
اس سفینے میں جلد جا پہنچا   یہ بھی واں ساتھ ہی لگا پہنچا
بیچ دریا میں دایہ نے جا کر   کفش اِس گل کی اُس کو دکھلا کر
پھینکی پانی کی سطح پر اِک بار   اور یوں بولی کہ او جگر افگار
حیف تیرے نگار کی پاپوش   موجِ دریا سے ہو دے ہم آغوش

غیرتِ عشق ہے تو لا اُس کو
چھوڑ مت یوں برہنہ پا اُس کو

پاؤں اُس کے جو ہیں نگار آلود
ظلم ہے ہوویں گر غبار آلود

یہ روا ہے تو اپنے حال پہ رو
مفت ناموس عشق کو مت کھو

جی اگر تھا عزیز اے ناکام
کیوں عبث عشق کو کیا بدنام

سُن کے یہ حرف دایۂ مکّار
دِل سے اُس کے گیا شکیب و قرار

بے خبر کارِ عشق کی تہ سے
جُست کی اُن نے اپنی جاگہ سے

تھا سفینے میں یا کہ دریا میں
موج زنجیر ہو گئی پا میں

کھنچ گیا قعر کو یہ گوہرِ ناب
تھی کشش عِشق کی مگر تہِ آب

کہتے ہیں ڈوبتے اُچھلتے ہیں
لیکن ایسے کوئی نکلتے ہیں

ڈوبے جو یوں کہیں وہ جا نکلے
غرق دریائے عشق کیا نکلے

عِشق نے آہ کھو دیا اُس کو
آخر آخر ڈبو دیا اُس کو

دایۂ حیلہ گر ہوئی دِل شاد
واں سے کشتی چلی بہ رنگِ باد

یہ نہ سمجھی کہ عشق آفت ہے
فِتنہ سازی میں اِک قیامت ہے

وصل جیتے نہ ہو میسر اگر
لاوے معشوق کو یہ تربت پر

یاں سے عاشق اگر گئے ناشاد
خاکِ خوباں بھی اُن نے دی برباد

قِصّہ کوتاہ بعد یک ہفتہ
آئی وہ رشکِ مہ ز خود رفتہ

کہنے لاگی کہ اَب تو لے دایہ
ہو گیا غرق وہ فرومایہ

اب تو وہ ننگ درمیاں سے گیا
آرزومند اِس جہاں سے گیا

شور فتنے تھے اِس تلک سارے
اُب تو بدنامیاں نہیں مارے

وحشتِ طبع اب تو افزوں ہے
حال جی کا مرے دگرگوں ہے

دل کوئی دم میں خون ہووے گا
آج کل میں جنون ہووے گا

جی میں آتا ہے ہوں بیابانی
پر رکھوں ہوں کہ ہے یہ نادانی

مصلحت ہے کہ مجھ کو لے چل گھر
ایک دو دم رہیں گے دریا پر

گاہ باشد کہ دل مرادا ہو
ورنہ کیا جانیے کہ پھر کیا ہو

دایہ بولی کہ اے سراپا ناز
حسن کا در پہ تیرے روئے نیاز

اب تو میں فتنے کو سلایا ہے
اس بلا کے تئیں بٹھایا ہے

کون مانع ہے گھر کے چلنے کا
سدِ راہ کون ہے نکلنے کا

صبح گاہاں وہ غیرتِ خورشید
اس جگہ سے رواں ہوئی نومید

پہنچی نصف النہار دریا پر
روئی بے اختیار دریا پر

حد سے افزوں جو بے قرار ہوئی
دایہ کشتی میں لے سوار ہوئی

حرفِ زن یوں ہوئی کہ اے دایہ
یاں گرا تھا کہاں وہ کم مایہ

موج سے تھا کدھر کو ہم آغوش
تھا تلاطم سے کس طرف ہم دوش

تجھ کو آیا نظر کہاں آکر
پھر جو ڈوبا تو کس جگہ جا کر

مجھ کو دیجو نشان اس جا کا
میں بھی دیکھوں خروش دریا کا

مکر میں گرچہ دایہ تھی کامل
لیک تہ سے سخن کے تھی غافل

یہ نہ سمجھی کہ ہے فریبِ عشق
ہے یہ مہ پارہ ناشکیبِ عشق

بیچ دریا کے جا کہا یہ حرف
یاں ہوا تھا وہ ماجرائے شگرف

یاں وہ بیٹھا حباب کے مانند
پھر نہ تھا کچھ سراب کے مانند

سنتے ہی یہ کہاں کہاں کر کر — گر پڑی قصدِ ترکِ جاں کر کر
موج ہر اک کمندِ شوق تھی آہ — لپٹی اس کو بہ رنگِ مارِ سیاہ
دام گسترده عشق تھا تہِ آب — جس کے حلقے تمام تھے گرداب
حسن موجوں میں یوں نظر آوے — نورِ مہتاب جیسے لہرا دے
کھینچ کر کوفت سب ہوئے بیتاب — نہ لگا ہاتھ وہ دُرِ نایاب
جا ہم آغوشِ مُردہ یار ہوئی — تہ میں دریا کے ہم کنار ہوئی
سر پٹکتی جو گھر گئی دایہ — آفت اک لے گئی نئی دایہ
خلق یک جا ہوئی کنارے پر — حشر برپا ہوئی کنارے پر
دام داروں نے سب نے کام لیا — آخر ان کو اسیرِ دام کیا
نکلے باہم ولے موئے نکلے — دونوں دست و بغل ہوئے نکلے
جو نظر اُن کو آن کرتے تھے — ایک قالب گمان کرتے تھے
حیرتِ کارِ عشق سے مَردم — شکلِ تصویر آپ میں تھے گم

خواب و خیال میر

خوشا حال اس کا جو معدوم ہے — کہ احوال اپنا تو معلوم ہے
زمانے نے رکھا مجھے متصل — پراگندہ روزی پراگندہ دل
کئی کب پریشانیِ روزگار — رہا میں تو ہم طالعِ زلفِ یار
زمانے نے آوارہ چاہا مجھے — مری بے کسی نے نباہا مجھے
مجھے یہ زمانہ جدھر لے گیا — غریبانہ چندے بسر لے گیا
دلِ اک بار سو بے قرارِ بتاں — غبارِ سرِ رہ گزارِ بتاں
گرفتارِ رنج و مصیبت رہا — غریبِ دیارِ محبت رہا
چلا اکبرآباد سے جس گھڑی — در و بام پر چشمِ حسرت پڑی
کہ ترکِ وطن پہلے کیوں کر کروں — نگہ ہر قدم دل کو پتھر کروں
دلِ مضطرب اشکِ حسرت ہوا — جگر رخصتانے میں رخصت ہوا
پس از قطعِ رہ لائے دلّی میں بخت — بہت کھینچے یاں میں نے آزار سخت
جگر جورِ گردوں سے خوں ہو گیا — مجھے رکتے رکتے جنوں ہو گیا
ہوا خبط سے مجھ کو ربطِ تمام — لگی رہنے وحشت مجھے صبح و شام
یہ وہم غلط کاریاں تک کھنچا — کہ کارِ جنوں آسماں تک کھنچا

نظر رات کو چاند پر جا پڑی — تو گویا کہ بجلی سی دل پر پڑی
نظر آئی اک شکل مہتاب میں — کمی آئی جس سے خور و خواب میں
اگرچند پرتو سے مہ کے ڈروں — ولیکن نظر اس طرف ہی کروں
جو دیکھوں تو آنکھوں سے لوہو بہے — نہ دیکھوں تو جی پر قیامت رہے
وہی جلوہ ہر آن کے ساتھ تھا — تصور مری جان کے ساتھ تھا
سراپا میں جس جا نظر کیجیے — نہیں عمر اپنی بسر کیجیے
کہیں نقش دیوار دیکھا اسے — کہیں گرم رفتار دیکھا اسے
کہیں جلوہ پرداز وہ عشوہ ساز — کہیں ایستادہ بہ صد رنگِ ناز
کبھو یک بہ یک یار ہو جائے وہ — کبھو دستِ بردار ہو جائے وہ
گلے میں مرے ہاتھ ڈالے کبھو — طرح دشمنی کی نکالے کبھو
جو میں ہاتھ ڈالوں وہاں کچھ نہیں — بجز شکل وہمی عیاں کچھ نہیں
ہر اک رات چندے یہ صورت رہی — اِسی شکل وہمی سے صحبت رہی
طبیبوں کو آخر دکھایا مجھے — نہ پینا جو کچھ تھا پلایا مجھے
دوا جو لکھی سو خلاف مزاج — کھنچا اس خرابی سے کارِ علاج
جنون آہ در پے ہوا جان کے — مجوز ہوئے یار زندان کے
کیا بند اک کوٹھری میں مجھے — کہ آتش جنوں کی مگر واں بجھے
وہ حجرہ جو تھا گور سے تنگ تر — در اُس کا نہ کھلتا تھا دو دو پہر
جو اس میں کبھو میں سنبھل بیٹھتا — تو باہر بھی اک دم نکل بیٹھتا
سرِ شام بیٹھا تھا میں ایک روز — اِفاقت نہ آئی تھی مجھ کو ہنوز

کہ یاروں نے برجستہ تدبیر کی | مرے خون میں کچھ نہ تقصیر کی
اگرچہ کہنے کو خوں کم کیا | لیا لوہو اتنا کہ بے دم کیا
بڑی دیر تک خون جاری رہا | میں بیہوش وہ رات ساری رہا
جگایا سحر مجھ کو اک شور سے | کھلی آنکھ میری بڑے زور سے
ہی دستِ فصاد میں نیشتر | وہی رنگ صحبت کا پیش نظر
لگے نشتر ایسے کہ لگتے نہیں | چبھے جیسے مژگاں کسو کے تئیں
ٹپکتا رہا دیر تک خونِ ناب | مجھے لے گئی بے خودی کی شراب
غا ضعف سے مجھ کو کیا کیا نہ تھی | افاقت گئی یوں کہ گویا نہ تھی
پس از چند آنکھیں ٹھہرنے لگیں | نگاہیں بھی کچھ کام کرنے لگیں
کسے تھا مری زندگانی کا دھیان | ولیکن نہایت تھا میں سخت جان
لگی جان سی آنے اعضا کے بیچ | کوئی روز رہنا تھا دنیا کے بیچ
غلط کاری وہم کچھ کم ہوئی | وہ صحبت جو رہتی تھی برہم ہوئی
وہ صورت کا وہم اور دیوانگی | لگی کرنے در پردہ بیگانگی
پس از دیر آنکھوں میں آنے لگی | نہ دو دوپہر منہ لگانے لگی
نہ دیکھے مری اور اس پیار سے | غریبانہ سر مارے دیوار سے
کہیں تک تسلی کہیں بے قرار | کہیں شوق سے میرے بے اختیار
کہیں واسطے میرے روتی ہے خوں | کہیں دست زیرِ زنخ ہے ستوں
کہیں دست بدل وہ رشکِ قمر | کہیں حسرت آلودہ مجھ پر نظر
کہیں چشمِ گریاں سے دامانِ پاک | کہیں سو جگہ سے گریبان چاک

کہیں مجھ سے کہتی ہی رخصت مجھے
کہ مطلق نہیں غم کی طاقت مجھے

کہیں وہ سخن جو جگر خون کرے
کہیں طرز ایسی کہ مفتوں کرے

کہیں وضع ایسی کہ بیگانہ ہے
کہیں آشنا ہے تو دیوانہ ہے

کسو جا ہے جلوے میں اس آن سے
کہے تو کہ بیزار ہی جان سے

کسو وقت اس کا یہ اسلوب ہے
کہ شرم محبت سے محجوب ہے

کبھو بے قراری ہی اس رنگ سے
کہ پھرتی ہی سر مارتی سنگ سے

کبھو یہ سخن جس سے ہو مستفاد
کہ اے بے وفا حرف من یاد باد

کہ ظاہر میں میر اب تو آنا گیا
کہ وہ دوستی کا زمانہ گیا

غرض ناامیدانہ کر اک نگاہ
وہ نقش تو ہم گیا سوئے ماہ

نہ آیا کبھو پھر نظر اس طرح
نہ دیکھا اُسے جلوہ گر اس طرح

مگر گاہ سایا سا مہتاب میں
کبھو وہم سا عالم خواب میں

مجھے آپ کو یو نہیں کھوتے گئی
جوانی تمام اپنی سوتے گئی

دکھایا نہ اس مہ نے رو خواب میں
نہ دیکھا پھر اس کو کبھو خواب میں

بہت بے خود و بے خبر ہو چکا
ہم آغوش طالع بہت سو چکا

نہ دیکھا کبھو میر پھر وہ جمال
وہ صحبت تھی گویا کہ خواب و خیال

در ہجو خانۂ خود

کیا لکھوں میر اپنے گھر کا حال　　اس خرابے میں میں ہوا پامال
گھر کہ تاریک و تیرہ زنداں ہے　　سخت دل تنگ یوسفِ جاں ہے
کوچۂ موج سے بھی آنگن تنگ　　کوٹھری کے حباب کے سے ڈھنگ
چار دیواری سو جگہ سے خم　　تر تنک ہو تو سوکھتے ہیں ہم
لونی لگ لگ کے جھڑتی ہے ماٹی　　آہ کیا عمر بے مزہ کاٹی
جھاڑ باندھا ہے مینھ نے دن رات　　گھر کی دیواریں ہیں گی جیسے پات
ایک حجرہ جو گھر میں ہے واقع　　سو شکستہ تر از دلِ عاشق
کہیں سوراخ ہے کہیں ہے چاک　　کہیں جھڑ جھڑ کے ڈھیر سی ہے خاک
کہیں گھر ہے کسو چھچھوندر کا　　شور ہر کونے میں ہے مچھر کا
کہیں مکڑی کے لٹکے ہیں جالے　　کہیں جھینگر کے بے مزہ نالے
کونے ٹوٹے ہیں طاق پھوٹے ہیں　　پتھر اپنی جگہ سے چھوٹے ہیں
آگے اس حجرے کے ہے اک ایوان　　وہی اس تنگِ خلق کا ہے مکان
کڑی تختے سبھی دھوئیں سے سیاہ　　اس کی چھت کی طرف ہمیشہ نگاہ
کوئی تختہ کہیں سے ٹوٹا ہے　　کوئی داسا کہیں سے چھوٹا ہے

دَب کے مرنا ہمیشہ مدِّنظر — گھر کہاں صاف موت ہی کا گھر
مضطرب ہو کے جو کچھائی بہت — ہر کڑی نے کڑی اٹھائی بہت
برسے اس مینھ میں کہ سختی ہے — تختے تختا ہوئے یہ سختی ہے
کیوں کہ ساون کٹے گا اب کی بار — تھرتھراوے جھنجھری سی دیوار
ہو گیا ہے جو اتفاق ایسا — شاق گزرے ہے کیا کہوں کیسا
ہو کے مضطر لگے ہیں کہنے سب — اُڑ جھنجھری کہ ساون آیا اب
ایک دن ایک کوّا آ بیٹھا — بے گماں جیسے ہوّا آ بیٹھا
نہیں وہ زاغ چار پاؤں پھرا — ایک کالا پہاڑ آن گرا
مٹی اس کی کہیں کہیں بھسکی — جی ڈہا اور چھاتی بھی دھسکی
سان کر خاک لگ گئے دو چار — بارے جلدی درست کی دیوار
اچھے ہوں گے کھنڈر بھی اس گھر سے — برسے ہے اک خرابی گھر در سے
بند رکھتا ہوں در جو گھر میں ہوں — قدر کیا گھر کی جب کہ میں ہی نہ ہوں
گھر بھی پھر ایسا جیسا ہے مذکور — ہے خرابی سے شہر میں مشہور
جس سے پوچھو اسے بتا دے شتاب — ساری بستی میں ہے یہی تو خراب
ایک چھپر ہے شہر دلّی کا — جیسے روضہ ہو شیخ چلّی کا
مینھ میں کیوں نہ بھیگئے یک سر — پھونس تو بھی نہیں ہے چھپر پر
مٹی ہو کر گرا ہے سب ڈالا — وہ رہے ہاں جو ہووے ڈھب ڈالا
ٹپکے دو چار جا تو بند کروں — تیغ کوئی لڑاؤں فند کروں
یاں تو جھانکے ہزار میں تنہا — کچھ نہیں ہائے مجھ سے ہو سکتا

بس کہ بد رنگ ٹپکے ہے پانی　　کپڑے رہتے ہیں میرے افشانی

مجھ سے کیا واقعی ہوا چارا　　آسماں جو پھٹے تو کیا چارا

بان جھینگر تمام چاٹ گئے　　بھیگ کر بانس پھاٹ پھاٹ گئے

پوچھ مت زندگانی کیسی ہے　　ایسے چھپر کی ایسی تیسی ہے

جنس اعلیٰ کوئی کھٹولا کھاٹ　　پائے پٹی رہے ہیں جن کے پھاٹ

کھٹملوں سے سیاہ ہے سو بھی　　چین پڑتا نہیں ہے شب کو بھی

شب بچھونا جو میں بچھاتا ہوں　　سر پہ روزِ سیاہ لاتا ہوں

کیڑا ایک ایک پھر سکوڑا ہے　　سانجھ سے کھانے ہی کو دوڑا ہے

گرچہ بہتوں کو میں مسل مارا　　پر مجھے کھٹملوں نے مل مارا

ملتے راتوں کو گھس گئیں پوریں　　ناخنوں کی ہیں لال سب کوریں

ہاتھ تکیے پہ گہ بچھونے پر　　کبھو چادر کے کونے کونے پر

ہاتھ کو چین ہو تو کچھ کہیے　　کب تلک یوں ٹٹولتے رہیے

یہ جو بارش ہوئی تو آخر کار　　اس میں سی سالہ وہ گری دیوار

آہ کھینچی خرابی کیا کیا نہ　　تھے جو ہم سائے وے ہیں ہم خانہ

ایسے ہوتے ہیں گھر میں تو بیٹھے　　جیسے رستے میں کوئی ہو بیٹھے

غم ہوا اس کے دوست داروں کو　　پھر بندھا یہ خیال یاروں کو

کہ مری بود و باش یاں نہ رہے　　گو تصرّف میں یہ مکاں نہ رہے

شہر میں جا بہم نہ پہنچی کہیں　　چار نا چار پھر رہا میں وہیں

اب وہی گھر ہے بے سروبایہ　　اور میں ہوں وہی فرومایہ

دن کو ہے دھوپ رات کو ہے اوس — خواب راحت ہے یاں سے سو کوس
قصہ کوتہ دن اپنے کھوتا ہوں — رات کے وقت گھر میں ہوتا ہوں

نہ اثر بام کا نہ کچھ در کا
گھر ہے کاہے کا نام ہے گھر کا

در ہجو نااہل مسمّی بہ زبان زد عالم

سنیو اے اہل سخن بعد از سلام — چھیڑتا ہے مجھ کو اک تخم حرام
کام مجھ کو کچھ نہیں ہے اور سے — بلکہ اس بھی طرز سے اس طور سے
شاعری کو میری جو گے جانتے — تم چناں چہ سب مجھے ہو مانتے
میں ہمیشہ سے رہا ہوں باوقار — کن دنوں تھا ہجو کا کرنا شعار
گر کنھوں نے کچھ کہا میں چپ رہا — ہجو اس کی ہوگئی اس کا کہا
کیا ہوا اگر چاند پر پھینکے ہیں خاک — پڑتی ہے ان سب کے منہ پر میں ہوں پاک
رہیو شاہد کچھ نہیں میرا گناہ — مدعی بے ہیچ ہے یہ روسیاہ
تھا تحمل مجھ کو میں درویش تھا — دردمند و عاشق و دل ریش تھا
پر کروں کیا لاعلاجی سی ہے اب — غصے کے مارے چڑھی ہے مجھ کو تپ
ایسے کہتے ہیں جواب شاعرینے — بدقولی یہ لونڈے آئے مجھ کنے
ایک باتوں سے مری آدم ہوا — اک نظر سے شہرۂ عالم ہوا
ایک نے دیوان کی میرے نقل لی — اس دوانے کی کنھوں نے عقل لی
ایک میرے طرز پر کہنے لگا — دوسرا پیرو مرا رہنے لگا

سارے عالم پر ہوں میں چھایا ہوا — مستند ہے میرا فرمایا ہوا

دُور سے کرتا ہوں بیٹھا سب کی دید — کوئی سرکھینچو ہے میرا مستفید

کوئی بےتہ گر نہ جانے میری قدر — پائیں ہے پائین آخر صدرِ صدر

ہے گی شخصیت خدا کی اور سے — ہاتھ کب آوے بزرگی زور سے

جو بڑے ہیں وے ہی آخر ہیں بڑے — ایسے نیچے بہت پھرتے ہیں پڑے

شہر میں آیا میں بعد از بست سال — گم تھا یاں سر رشتۂ قال و مقال

کسب جو کرتے تھے یہ فنِ شریف — ان میں سے کوئی نہ تھا میرا حریف

کتنے اِک نومشق تھے گرمِ سخن — سو بچارے آپ ہی ناگاہِ فن

مدعی میرا ہوا یہ بے ہنر — مردۂ صد سالہ سا بے نورتر

بے سبب سرگرم کیں ہم سے ہوا — مستحق لعنتِ عالم ہوا

چل قلم اب ہے ارادہ جنگ کا — پاس کب تک کیجئے نام و ننگ کا

یاں زبردستوں کو دعویٰ کھا گیا — یہ چُھپا رستم کہاں سے آ گیا

ناقباحت فہم کو دعوے بڑا — ہو کے تنکا سا پہاڑوں سے اڑا

ہاتھی کی ٹکر کو ہاتھی ہی اُٹھائے — چیونٹی کا کیا جگر جو منہ پہ آئے

جنگ ہاتھی کی ہو گو اُس کو ہوس — پر اُسے ہے موت کا ریلا ہی بس

میں نے پاس اس کا کیا حد سے زیاد — پر کجی کرتا ہے یہ ابنِ زیاد

قبلہ سمجھے کہتے حاجی ہو گیا — پاس ظاہر چھوڑ پاجی ہو گیا

رشکِ شہرت سے مری مرنے لگا — میری عزت کا حسد کرنے لگا

لگ گئی چپ اس کو میرے شعر سے
یہ نہ سمجھا ہے خدا کی اور سے

یہ قبولِ خاطرِ لطفِ سخن
دے ہے کب سب کو خدائے ذوالمنن

ایک دو ہی ہوتے ہیں خوش طرز و طور
اب چناں چہ میر و مرزا کا ہے دور

دشمنی تھی اس کو مجھ سے کیا ضرور
حیف ایسی عقل لعنت یہ شعور

خونِ دل آشام ہیں جو صبح و شام
وے بھی لیتے ہیں ادب سے میرا نام

یہ مری رہ کا نہ حائل ہو سکے
یہ موئی جوں کیا مقابل ہو سکے

ہجو کی جو اُن نے میں کیا دب گیا
بھونکنے پہ سگ کے ہاتھی کب گیا

ننگ ہے میری توجہ اس طرف
حیف ہے میلانِ دریا سوئے کف

دار و دستی سے ہے اُسکے مجھ کو شرم
تب تو میں باتیں کروں ہوں نرم نرم

جو نہ سمجھا تیغ خامے کی ہے پاس
کاٹوں گا یوں جس طرح کٹتی ہے گھاس

کیا کمی ہے یہ جو عزت کم کرے
گو نہ شیطاں سجدۂ آدم کرے

کرتی ہے تعظیم میری کائنات
لعنت اس پر ہوتی ہے دن اور رات

بیت کہنا چاہتا ہے سو ہنر
شاعری سمجھا تھا کیا خالہ کا گھر

گرگ گردن خوک چشم و غوک سر
غولِ صحرائی کا بچہ ہے مگر

بار سکھیاں کہہ کے شاعر ہو گیا
اس فنِ مشکل کا ماہر ہو گیا

قلم نفریں ہے میری بس اسے
ہے دماغ بحث پاجی اب کسے

رکھ زباں کیدھر گیا تیرا مزاج
پوچ گو بہتیرے پھرتے ہیں پواج

در ہجو شخصے ہیچمداں کہ دعوائے ہمہ دانی داشت

اس چرخ بے مدار کے کیا کیا کروں گلے ۔ میرے جگر میں جیسے ستارے ہیں آبلے
تنکا سا اُن نے جور و جفا کر سکھا دیا ۔ پھر تس پہ میرے رونے نے مجھ کو بہا دیا
اُس مجمع کمال کے گھر لے گیا یہ زور ۔ جس کو تمام فنوں میں گویا کہ تھا عبور
مصروف علم صرف کا تھا لیک اس سے حرف ۔ پوچھو جو اسم آلہ سے تو بول اٹھے کہ ظرف
یہ سن کے تم ہنسو ہو تو وہ رو کے ایک بار ۔ کہنے لگے کہ اپنا یہ صیغہ نہیں ہے یار
کرتا ہو بحث نحو میں جس دم وہ بادہ گیر ۔ ہر نحو کا ہے لفظ فقط حرف یاد گیر
فن بیاں میں کیسا ہے تشبیہ کس سے دو ۔ عالم کنایہ اس سے کیا ہے میں کیا کہوں
پوچھو مجاز کی جو حقیقت ہو لا علاج ۔ کہنے لگے کہ رات سے بھیکا ملا مزاج
اور لفظ بھی مزاج ہے ناداں نہ ہے مجاز ۔ ہتنے کہے تو اس کے کہے قصۂ دراز
علم معانی سے جو کیا ایک دن سوال ۔ کہنے لگا حقیقت عقلی تو ہے محال
لیکن مجاز عقلی کو ناداں یاد رکھ ۔ یاں کون پوچھتا ہے دل اپنے کو شاد رکھ
ہے اب فصاحت اور بلاغت سو جانے دے ۔ یہ دونوں عیب شعر میں اپنے نہ آنے دے
اک دن سوال علم قوافی سے میں کیا ۔ کہنے لگا کہ قید نہیں اس میں مطلقا
تم آب قافیہ نہ کرو لفظ خاک کا ۔ یا آتش اور باد کا زنجیر و تاک کا
لیکن مغائرہ ہو مقرر ردیف میں ۔ آتا ہے یہ کچھ اپنے تو ذہن شریف میں
پھر شعر وصل و ہجر کے موزوں تم کرو ۔ عرصہ ہوا وسیع جواب جا ہو سو کہو
دعویٰ جتاؤں کیا ہے انھیں فن شعر کا ۔ معنی جو قافیہ کے کوئی پوچھتا تھا آ

بے علم کرتا قافیہ تنگ اس کی جان پر
تُنے مارتا تھا ہاتھوں کو وہ اپنی ران پر

کہتا تھا ہائے ہائے مرے بعد ہوگا کیا
ان احمقوں کے جینے کے پیچھے تو مر گیا

مر جاؤں گا تو گور پہ میری نہ آئیں گے
دو کوزے آب کے بھی یہ ہرگز نہ لائیں گے

لیکن مجھے تو بخل نہیں ہے سنا عزیز
سنیو تو گوشِ دل سے اگر ہے تجھے تمیز

ایما اشارہ رہنے دے کہتا ہوں اب صریح
اوّل ہی لفظ کا نہیں ہے قافیہ صحیح

میں جو سنا ہے کافیہ ہے چھوٹے کاف سے
پس پڑھنا تو غلط ہوا اب اس کا قاف سے

اور اس میں ایک نکتہ بھی کرتا ہوں میں بیاں
پھر بولا ہائے ہائے نہیں کوئی قدرداں

ورنہ مرے دہن کو جواہر سے پُر کرے
یہ لعل اگلوں ہوں ہیں مجھے سراد پہ دھرے

ہائے وہ نکتہ یہ ہے لگا کہنے کر خطاب
ہے ایک علم جفر میں بھی کافیہ کتاب

تصحیح صرف ہو چکی اب میرے اُسکے سن
ورنہ لگے ہے ذہن میں ان نیتوں کو گھن

استادوں سے سنا تھا جو میں نے نہیں ہے یاد
اور اب جہاں کے بیچ نہیں کوئی اوستاد

ہر اک سے پوچھنے کو نہیں چاہتا ہے جی
لائق نہیں جو پوچھیے اب قافیہ روی

یہ کہہ کے آپ ہی بولا کہ کہنے کا کیا حصول
اس معنی کو کہے یہ مرے کیجیو قبول

اس شخص کا جو محدث ہے سو یہ ہے میرے یار
ہر چند اس کو گوزِ شتر جانے سب دیار

پر دیکر کہوں ہوں بتا رہیں احتیاط
حرفِ غلط کا تا نہ ہو معنی سے اختلاط

یا پھل ہے وہ ثنا کا جو لگتا ہے جھاڑ میں
یا کاہِ خشک ہے جو اگے ہے پہاڑ میں

میں نے کہا کہ کہتے ہیں تم کو عروض داں
بحرِ رمل کی مجھ سے حقیقت کرو بیاں

بولا کہ تیری عقل سے آتا ہے بس عجب
دریا کا ایک نام ہے بحر کیا کہوں سبب

پھر میں نے کیا سوال بہ صد انکسار و عجز
بحر طویل بحر مدید اور بحر رجز

ان میں جو ہی گا فاصلہ مجھکو بتائیے　　کامل سے مل کے حیف ہے ناقص جو جائیے
بولا کہ تجھ کو عقل نہیں ماکجا کہوں　　یوں تربیت میں تجھ سے کی میں کہ تا لک نہ ہوں
یہ تینوں رود خانے میں وہ ہر بسیط میں　　ملتے ہیں غنہ رفتہ سبھی جا محیط میں
بحر طویل ایک ہے دریا بہت بڑا　　بحر خفیف ایک ہے پاس اس کے آ بنا
اک دن کیا سوال شہانِ سلف سے میں　　پرویز کے انھوں میں خصوصاً سلف سے میں
اس نے کہا کہ خوب کہا طرفہ نقل ہے　　رکھتا ہے حافظہ میں اسے جس کو عقل ہے
امرد تھا ایک اُن دنوں شیریں تھا اس کا نام　　یہ اسکی دشمنی میں ہوا یو نہیں تلخ کام
یہ سُن کے مارا خسرو پرویز نے اسے　　بے دم کیا ہے خنجر یہ تیز سے اُسے
علم لغت میں عمر بھی اسکی ہوئی تھی صرف　　کرتا سوال اس سے جو جا کر میں ایک حرف
مثلاً کہا کہ نخل ہے کیا اس کو کر بیاں　　وہ در جواب اس کے وہیں کھل کر زباں
بولا کہ اک جزیرہ ہے سمت فرنگ کو　　مارا تھا ان فرنگیوں نے اس نہنگ کو
اب خاک سے نہنگ کی واں اک نہال ہے　　شیر و پلنگ کا وہ صدا پایمال ہے
اس کے ثمر کو بعض تو کہتے ہیں تاڑ پھل　　ہے مغزوں کا جو فرقہ ہے کہتا ہے ناریل
تحقیق اپنی یہ ہے کہ ہے نخل اصل حرف　　تصحیف ہو گئے ہے جو ہوتا ہے خ سے خرف
وہ نخل کیا کہ جانور و چار پایہ ہے　　دم اتنی لمبی ہے کہ وہی سر کا سایہ ہے

جو جو ہوئے ہیں چرخ سے مجھ پر ستم مدام　　جیتا رہا تو میر کروں گا گلے تمام
اپنی تو بد زبانی نہ تھی خامے کا شعار　　پر یہ بھی ہے جریدۂ عالم میں یادگار

تنبیہ الجہال

صحبتیں جب تھیں تو یہ فن شریف / کسب کرتے جن کی طبعیں تھیں لطیف
تھے تمیز درمیاں انصاف تھا / خار و خس سے کیا یہ عرصہ صاف تھا
دخل اس فن میں نہ تھا اجلاف کو / کچھ بتاتے تھے بھی سو اشراف کو
تھے جو اس ایام میں استادِ فن / ناکسوں سے وے نہ کرتے تھے سخن
پھر حصول اس سے نہ دنیا ہے نہ دیں / کوئی حاجت اس سے وابستہ نہیں
گر چمار اس کارخانہ میں نہ ہو / ٹوٹے جوتے کو کہاں لے کر پھرو
چار و ناچار اس کنے جانا پڑے / کوڑیاں دے جوتی گٹھوانا پڑے
حاجت اس فرقے سے متعلق یاں نہیں / جو نہ ہو شاعر تو کچھ نقصاں نہیں
یہ تو دنیا میں ہے اس فن کا کمال / دین کا اس فرقے کے پوچھو نہ حال
ہم تلک تھی بھی وہی رسم قدیم / یعنی جن کے ہوتے تھے ذہن سلیم
پیار کرتے تھے انھیں استادِ فن / ان کے ہوتے رہبرِ راہِ سخن
جلف داں زنہار پاتے تھے نہ بار / شاعری کا ہے کو تھی ان کا شعار
نکتہ پردازی سے اجلافوں کو کیا / شعر سے بزازوں ندافوں کو کیا
الغرض یاروں نے قیدیں یہ اٹھا / جو کوئی آیا اُسے دی پاس جا
کم نہ استعداد سے کی گفتگو / کچھ نہ رکھی شاعری کی آبرو
چار سکھیاں کہہ کے دینا کس کے ہاتھ / پھر اسے مجلس میں لائے اپنے ساتھ
آپ بیٹھے صدر میں وہ دستِ چپ / کرنے لاگے شاعری سے حرفِ گپ

بولے ان کو آج کل سے ہے خیال ذہن ان کا تیری رکھتا ہے کمال
جب ہوا ثابت وہ ان کا مستفید سب نے جانا اس کو شاگردِ رشید
کی اشارت تا کہ وہ کھولے دہن آگے استادوں کے ہو گرمِ سخن
ان کے ایما سے وہ کچھ پڑھنے لگا صاحبانِ فن کے منہ چڑھنے لگا
نیم قد اُٹھ اُٹھ کے یہ سُننے لگے جا و بیجا سر کے تئیں دھننے لگے
وہ سراپا جہل ناگہ وقت کار ہم سے تم سے کرنے لاگا اعتذار
سر میں رکھکر دعوئ طبع لطیف میر و مرزا کا ہوا آخر حریف
کیسی کیسی یوں گئیں طبعیں بباد آفریں شاگرد و رحمت استاد

در مذمّتِ دنیا

سُنو اے عزیزانِ ذی ہوش و عقل کہ اس کارواں گہ سے کرنا ہے نقل
پیمبر ہے شہ ہے کہ درویش ہے سبھوں کو یہی راہ درپیش ہے
کہو گے کہ آگے تھا رہتا کوئی نہیں اس سرا بیچ رہتا کوئی
جسے دیکھو چلنے کا گرمِ تلاش یہ منزل نہیں جائے بود و باش
گدا ہو کہ ہو شاہِ عالی تبار تہِ خاک سب کا ہے دار القرار
نہ یک بوئے خوش ہی ہوا ہو گئی وہ رنگینئ باغ کیا ہو گئی
ملے خاک میں بجز کے گل ہائے تر پریشاں ہوئے مرغِ گلشن کے پر
پتنگوں نے گر خاک مسکن کیا چراغوں نے بھی خانہ روشن کیا
گئی خاک دامن فشانی کے ساتھ رہا آب سو بھی روانی کے ساتھ

جوانی گئی موسمِ شیب ہے
شہود ایک دو روز کو غیب ہے

گیا شور سر سے جھکا ہے بہت
گئی واشداب دل رکا ہے بہت

نہ وہ ذائقہ ہے نہ وہ ہے مشام
مزا کچھ نہیں ہو چکی صبح و شام

بلا ارتعاش تنِ زار ہے
ہر اک عضو چلنے کو تیار ہے

ہوا حافظہ بس کہ نسیاں کا صرف
نہیں یاد آتا ہے دوشینہ حرف

ہوئے شعر کیا کیا فراموش ہائے
کہوں کیا گزرتی ہے خاموش ہائے

شباب آہ داغِ جگر دے گیا
قدِ خم زمیں کی طرف لے گیا

نہ کچھ زورِ بازو بہت کم ہوا
جھکا سر سوئے زانو کا ہم دم ہوا

جوانی کی شب کیا بسر ہو گئی
سفیدی ہوئے سے سحر ہو گئی

جو یوں پاؤں چلتے بچلتے رہے
تو دیکھو گے ہم یاں سے چلتے رہے

اگر ضعف سے چپ ہی لگتے ہیں ہم
یہ سوچو تو کیا کیا نہ کہتے ہیں ہم

جو بازو ہیں اپنے وہ بازو نہیں
اگر منہ کو دیکھو تو وہ رو نہیں

بدن کی ہوئی میرے صورت ہی اور
وے آنکھیں نہیں جن سے جیتوں کے طور

چھڑکتا رہوں منہ پہ میں آب کاش
کہ ہوتا رہے روح کا انتعاش

وگرنہ دیا سا بجھا جائے ہے
پھر اٹھ بیٹھوں تو جی چلا جائے ہے

سیہ روئے شیب اک ستم کر گیا
لکھوں کیا کہ میں جیتے جی مر گیا

قلم رکھ دے کر میرؔ مختتم کلام
تمام اپنی صحبت ہوئی والسلام

متفرّقاتْ

(مخمس)

درحالِ لشکر

خلل اپنی ہوئی جو بود و باش   آئے لشکر میں ہم برائے تلاش
آن کے دیکھی یاں کی طرفہ معاش   ہے لبِ ناں پہ سو جگہ پرخاش
نے دمِ آب ہے نہ چمچۂ آش

مرنے کے مرتبے میں ہیں احباب   جو شناسا ملا سو بے اسباب
تنگ دستی سے سب یہ حالِ خراب   جس کے ہے پال تو نہیں ہے طناب
جس کے ہے فرش تو نہیں فراش

دندگالی ہوئی ہے سب پہ وبال   کنجڑے جھینکیں ہیں روتے ہیں بقال
پوچھ مت کچھ سپاہیوں کا حال   ایک تلوار بیچے ہے اک ڈھال
بادشاہ و وزیر سب قلاش

جتنے والے جو تھے ہوئے ہیں فقیر   تن سے ظاہر رگیں ہیں جیسے لکیر
ہیں معذب غرض صغیر و کبیر   مکھیاں سی گریں ہزاروں فقیر
دیکھیں ٹکڑا اگر برابر ماش

شور مطلق نہیں کسو، سر میں   زور باقی نہ اسپ و اشتر میں
بھوکھ کا ذکر اقل و اکثر میں   خانہ جنگی ہے اس لشکر میں
نہ کوئی رند ہے نہ کوئی اوباش

ہو جو اُن لوگوں میں گدا کا گزر
سہم نہ جائیں سب نہ دیکھیں اُدھر
دیر کے بعد یہ کہیں ہل کر
شاہ جی لے خدا سبھوں کی خبر
سو بھی نہ بات ہے پس اذ کنگاشش
یاروں کی جود کا بیاں کیا ہے
وہم میں اُن کے بھی جہاں کیا ہے
آشکارا ہے سب نہاں کیا ہے
دیکھتے ہیں کہیں کہ یاں کیا ہے
ایسی صحبت میں ہم نہ ہوتے کاش
بس قلم اب زباں کو اپنی سنبھال
خوش نما کب ہے ایسی قال و مقال
ہے کذعب چرخ روسیہ کی چال
مصلحت ہے کہ رہیے ہو کر لال
فائدہ کیا جو راز کرے فاش

در ہجوِ لشکر

جس کسو کو خدا کرے گم راہ
آوے لشکر میں رکھ اُمیدِ رفاہ
یاں نہ کوئی وزیر ہے نے شاہ
جس کو دیکھو سو ہے بحالِ تباہ
طرفہ مردم ہوئے اکھٹے آہ
جائیے جس کے یہاں وہ روتا ہے
یا کہے چوب دار سوتا ہے
جو مقدر ہے سو تو ہوتا ہے
کون وقتِ عزیز کھوتا ہے
میں تو تجھ کوں نہ ایسوں پر واللہ
فوج میں جس کو دیکھو سو ہے اُداس
جھکّے سے عقل گم نہیں ہیں حواس

بیچ کھایا ہے سب نے ساز و لباس   چیتھڑوں بن نہیں کسو کے پاس
یعنی حاضر یراق ہیں گے سپاہ

خاک اڑتی ہے صبح سے تا شام   شام سے صبح تک ہے فکرِ طعام
رحم کی جا ہے، حال تنگِ انام   ایک دو ہوں تو لوں کسو کا نام
سینکڑوں کے نہیں جگر میں آہ

مفلسی سے رہا ہے کس میں حال   خورش و خواب ہیں گے خواب و خیال
چار دن عمر کے ہوئے ہیں وبال   زندگی اپنے طور پر ہے محال
مرگ ملتی نہیں ہے خاطر خواہ

جاؤ کرتے تلاش جس کے گھر   پہنچنا اس تلک بہت دوبھر
راہ مطلق نہیں نکلتی ادھر   باعثِ صد فساد و شور و شر
دس تلنگے ہیں در پہ بے گہ و گاہ

دیکھے میں نے مصاحبانِ شہ   نکلے سب حقیقت و بے تہ
ٹھہری آخر کو اُن سے کچھ مت کہہ   رہ سکے ہے کسی طرح تو رہ
ورنہ لشکر سے جا خدا ہمراہ

فقر و فاقہ کی ہر طرف ہے دھوم   دو تلنگے جہاں ہیں واں ہے ہجوم
لشکر اک ہے خرابۂ مردم بوم   زندگی کرنے کی طرح معلوم
کہہ رہے جوں خدا ہی ہے آگاہ

قصہ کوتہ کہاں نہ رو گزرا   کون سی مشکل میں نہ ہو گزرا
آبرو رفتہ گھر کو گزرا   یاں گزرتا تھا ظلم جو گزرا

اس پہ جس کو ہو قصد بسم اللّٰہ

در شہر کاما بحسبِ حالِ خود

قابل ہے میری سیر کے اطوار روزگار   چالیں عجب طرح کی چلے ہیں عجب شعار
کرتا ہے بدسلوکی سبھوں سے یہ بے مدار   لاتا ہے روز فتنۂ تازہ بروئے کار
دل داغ داغ رہتے ہیں اس سے جگر فگار

کاما سے تلخ کام اُٹھایا مرے تئیں   دلی میں بے دلانہ پھرایا مرے تئیں
ہم چشموں کی نظر سے گرایا مرے تئیں   حاصل کہ پیس سرمہ بنایا مرے تئیں
میں مشت خاک مجھ سے اسے اس قدر غبار

لشکر میں مجھ کو شہر سے لایا پئے تلاش   یاں آکے گزری میری عجب طور سے معاش
پانی کسو سے مانگ پیا میں کسو سے آش   اس واقعہ سے آگے اجل پہنچی ہوتی کاش
ناموس رہتی شہر کی جاتا نہ اعتبار

جانا نہ تھا جہاں مجھے سو بار واں گیا   ضعفِ قویٰ سے دست بہ دیوار واں گیا
محتاج ہو کے ناں کا طلبگار واں گیا   چارہ نہ دیکھا مضطر و ناچار واں گیا
اس جانِ ناتواں پہ کیا صبر اختیار

در در پہ ہر اک دنی کے سماجت مری گئی   نالائقوں سے ملتے لیاقت مری گئی
کیا مفت ہائے شان شرافت مری گئی   ایسا پھرایا اس نے کہ طاقت مری گئی
مشہور شہر اب ہوں سبکسار و بے وقار

عرصہ تھا مجھ پہ تنگ اٹھا ہو کے نیم جاں   پوچھا نہ مجھ کو یک لبِ ناں سے کسو نے یاں

کم پائی پر بھی سیر کیا میں نے سب جہاں   آشفتہ خاطری نے پھرایا کہاں کہاں
یہ سعل کا راز مجھ سے ہوا آکے آشکار

حاجت مری روا دلِ پُر درد نے نہ کی   تاثیر اشکِ سرخ و رخِ زرد نے نہ کی
تدبیر ایک دم بھی دمِ سرد نے نہ کی   دلجوئی میری حیف کسی فرد نے نہ کی
طاقت رہی نہ دل میں گیا جان سے قرار

دل سر بہ سر خراب ہے تعمیر کیا کروں   آشفتگیٔ حال کی تعبیر کیا کروں
خوں نابہائے چشم کی تقریر کیا کروں   زردیٔ رنگِ چہرہ کی تحریر کیا کروں
آیا جو میں چمن میں خزاں ہو گئی بہار

حالت تو یہ کہ مجھ کو غموں سے نہیں فراغ   دِل سوزشِ درونی سے جلتا ہے جوں چراغ
سینہ تمام چاک ہے سارا جگر ہے داغ   ہے نام مجلسوں میں مرا میرؔ بے دماغ
ازبس کہ کم دماغی نے پایا ہے اشتہار

مخمس دیگر

دستخطی فرد کا سنو احوال   بے دماغی ہی میں تو دی تھی ڈال
ایک مشفق کو تھا ادھر کا خیال   مہربانی سے اُن نے کھینچ نکال
شیخ جی کا ڑھے سو عجائب مال

آشنا میرے بھی پُرانے تھے   ہیں وے اِک عمر اک ٹھکانے تھے
یار تھے دوست تھے یگانے تھے   صحبتیں تھیں بہم زمانے تھے
روز و شب ہم دِگر تھی قال مقال

اب وہی مختار کے ہوئے مختار ‌ ‌ ‌ ان پہ ٹھہرا ہے سلطنت کا مدار
وہی اس عہد میں ہیں کار برآر ‌ ‌ ‌ اس طرف سے مرا ہوا جو گزار
نکلے سُن نام بہر استقبال

جب ملاقات درمیاں آئی ‌ ‌ ‌ دستخطی فرد میں نے دکھلائی
لے کے میری تسلّی فرمائی ‌ ‌ ‌ پھر نفر پاس اپنے رکھوائی
اور لگے کہنے رکھیئے استقلال

فرد نوّاب کو دکھاؤں گا ‌ ‌ ‌ حال صاحب کا سب جتاؤں گا
ہے مقدّر تو کری لاؤں گا ‌ ‌ ‌ لے کے دفتر میں آپ جاؤں گا
آگے میرے کسے سخن کی مجال

تم بنی فاطمہ ہو ہم ہیں غلام ‌ ‌ ‌ ہے غلامی تمہاری اپنا کام
تم کو مسجود جانتے ہیں انام ‌ ‌ ‌ تم سبھوں کے ہو پیشوا و امام
تم سے سب کو نجات کا ہے سوال

بارے رخصت کیا بصد اعزاز ‌ ‌ ‌ اور کہا تم ہو خلق میں ممتاز
ہے تمنّا کہ تم سے ہوں دم ساز ‌ ‌ ‌ دِل ہمارا ہو کاش محو نیاز
کریئے تم پر نثار جان و مال

شیخ نے کر سلوک حد سے زیاد ‌ ‌ ‌ قید اندوہ سے کیا آزاد
دی بھلا روزگار کی بے داد ‌ ‌ ‌ جان غم کش ہوئی نہایت شاد
کم ہوا کوئی روز سر سے وبال

پھر جو دو دن میں میں گیا اُن پاس ‌ ‌ ‌ شیخ جی نکلے ایک اشرالنّاس

سنے وہ تعظیم و خلق سنے وہ پاس ۔ بولے کچھ زیرِ لب اُداس اُداس
رہ گیا چپ میں دیکھ کر یہ حال

میرے تئیں بے دماغ جو پایا سر کیا نیچے یعنی شرمایا
جب خجالت سے کچھ نہ بن آیا تب بہا تا صداغ کا لایا
پھر یہ بولا کہ کیوں ہے چہرہ لال

میں کہا وجہ ہے کہا کیسے میں کہا جو رکب تلک ہیسے
چند پامالِ چرخ رہ رہیسے جی میں ہے آپ لگائیے پیسے
تا کہ گردوں کی کچھ ہو سیدھی چال

تھی جو تم سے توقعِ یاری سو تو آئی ظہور میں ساری
ہوتی جو فردِ دستخطی جاری تو بھی یہ دن جو ایسے ہیں بھاری
کاٹتا یک طرف فقیر مثال

دستخطی فرد کا سنا جب نام کہنے لاگا کہ اب قریب ہے شام
بیٹھنے کا ہوا ہے وقت تمام پھر کسی روز کیجیئے گا کلام
اب تو میرے نہیں حواس بجال

تھا جو سختی سے فقر کی ناچار گھر گیا شیخ جی کے سو سو بار
نہ رہا کوئی توجہ شہ میں یار نہ کہا جن نے میرا حالِ زار
تنگ آیا میں مفلسی سے کمال

کچھ طرح اور جب نہ بن آئی میں ہوا شیخ جی سے مجرائی
کھینچی کیا کیا انھوں کی ہرزائی پر تسلی مری نہ فرمائی

مُفت عزّت گئی ہُوا پامال

راتوں کے تئیں مصیبتیں گزریں — اور دنوں کو قیامتیں گزریں
کچھ نہ پوچھو جو حالتیں گزریں — باتوں باتوں میں مدّتیں گزریں
وعدہ دو چار دِن نہ ماہ و سال

پھر جو اُس فرد کا ہوا مذکور — کہنے لاگے کہ نائب دستور
جانتا ہے تمہیں کہ ہو مشہور — پر کہے ہے رکھو مجھے معذور
جاری کرتا ہے اس کا امر محال

آمد آنے ہیں شاہ پر بھاری — اُس کی لوگوں نے کی ہے آب خواری
آپ ہے تو یہ ہے گرفتاری — فوج ہے گی تو قحط کی ماری
کیوں نہ جس جا رہے ہیں واں تھلکال

عمدے جو ہیں دنوں کو بھرتے ہیں — سو بھی اسباب گروی دھرتے ہیں
ہیں سپاہی سو بھوکے مرتے ہیں — لوہو پی پی کے زیست کرتے ہیں
ایک تلوار بیچے ہے اِک ڈھال

حاجت اِک عالم اپنی لاتا ہے — جو ہے سو جان کھائے جاتا ہے
کون یاں راہِ حرف پاتا ہے — اور جسے کوئی مُنہ لگاتا ہے
کاٹتا ہے وہ پہلے چومے گال

اُس کے اوپر ہے شہ تماشائی — اور چاہے ہے خرچ بالائی
ہر طرف پھیلی ہے یہ رُسوائی — کل چنانچہ ہمیں نظر آئی
لال خیمے کے گرد و سرپال

دینے کا ہو کہیں ٹھکانا بھی — جُود کو چاہیے زمانا بھی
یاں نہیں شہ کے گھر میں آنا بھی — کبھو ہوتا ہے پینا کھانا بھی
ورنہ بھوکے رہے ہیں بیٹھے نڈھال

حال یہ ہے جو اُس پہ ہو منظور — پھر بھی نواب سے کروں مذکور
گاہ باشد کہ ہو اُنھیں مقدور — پر سماجت ہے ایسی خرد سے دُور
لُطف کیا میں کہوں وے دیویں ٹال

میں کہا بس بہت خراب ہوا — پردے میں واں سے بھی جواب ہوا
دل ہوا داغ جی کباب ہوا — بارے ہونا جو تھا شتاب ہوا
کٹ رہے گا مرا بھی یہ جنجال

دل سے اپنے بھی اب بھلا دیجے — فرد میری مجھے منگا دیجے
ان خیالات کو اُڑا دیجے — بند چڑیا کی سی چھُڑا دیجے
بس بچھایا بہت فریب کا جال

ہنس کے بولے کہ فرد ہے حاضر — اور سمجھیے نہ مجھ کو بھی قاصر
جان کا ہوں تمہاری میں ناظر — جمع فرماؤ خاطر عاطر
اب نہیں پھر یہ کام لوں گا سنبھال

تب سے اب تک وہ فرد لاتا ہوں — گاہ بے گاہ اُن کے جاتا ہوں
وقت پاتا ہوں تو جتاتا ہوں — پر جواب اُن سے صاف پاتا ہوں
اب کی باری کا ہے یہ قیل و مقال

واسوخت

طرز اے رشکِ چمن اب تری کچھ تازی ہے ساتھ غیروں کے مرے حق میں سخن سازی ہے
داغ رکھنے کو مرے اُن ہی سے گل بازی ہے ہمدمی اُن سے اُنھیں سب سے ہم آوازی ہے
گوش کر میرے بھی شکوے کی طرف گُل کے رنگ
رُکتے رُکتے روشِ غنچہ ہوا ہوں دِل تنگ

ایک مُدت ہوئی بدنامی و رسوائی ہے بےکسی بےدِلی دل ریشی و تنہائی ہے
صبح جب دی ہے دعا گالی تری کھائی ہے ابتدا سے مری ذلت تجھے خوش آئی ہے
خلق کیا کیا تری بےطوریوں سے کہتی نہیں
میں بھی ناچار ہوں اب منہ میں زباں رہتی نہیں

پیار تجھ کو کیا کرتے اگر جانتے ہم کاش کہ تیری روش پہلے ہی پہچانتے ہم
جھوٹے جھوٹے ترے وعدے نہ کبھو مانتے ہم جی میں اب ٹھانی ہے جو کچھ سو تبھی ٹھانتے ہم
اِس قدر تجھ سے نہ لگ چلتے نہ آتے اس راہ
تو پری ہوتا تو کرتے نہ تری اُور نگاہ

یہ فریبندہ سخن گوش نہ کرتے ہرگز خواہشِ کنجِ دہن دل پہ نہ دھرتے ہرگز
سب شبِ وصل دن اس طور نہ بھرتے ہرگز لعلِ جاں بخش پہ یوں تیرے نہ مرتے ہرگز
اتفاقات سے ہو جاتی ملاقات تو خیر
دل تجرد پہ رکھا جب نہ کوئی یار نہ غیر

عشوہ و ناز و ادا سے کسو کو پھر کیا کام | جی نہ بے چین رہا کرتا نہ دل بے آرام
ہو گیا یوں تو کبھو ہو گیا آپس میں کلام | ہے رخ و زلف ترکن کا ہی کو ہر صبح و شام

جنس اچھی تری پر گرمیِ بازار کہاں
ستم گراں تو تو بہت ہو پہ خریدار کہاں

غم نہیں تجھ کو مری یاری و فاداری کا | نہ خیال آوے ہے بندے کی گرفتاری کا
طور چھوڑا نہ تنک تو نے ستم گاری کا | وہی عشوہ ہے شب و روز دل آزاری کا

پرسشِ حال کا بھی مجھ کو نہ ممنون رکھا
ہائے یہ خاطر کہ حزیں دل کے تئیں خون رکھا

ترکِ اخلاص کیا سب نے تجھے پیار کیا | رحم دل پر نہ کیا جان کو آزار کیا
چاہ سے اپنی عبث تجھ کو خبردار کیا | کیا کیا ہم نے کہ اِس معنی کا اظہار کیا

جو کہ الفاظ نہ شایاں تھے سو تو کہنے لگا
وجہ بے وجہ تو روپوش ہی اب رہنے لگا

آرسی کی کبھی صورت نہ دکھاتے تجھ کو | طرز یہ سرمہ کشی کی نہ سمجھاتے تجھ کو
دل ربائی کے نہ انداز بتاتے تجھ کو | کیوں بگڑتا تو جو ایسا نہ بناتے تجھ کو

مستیِ چشم سے ہوتی نہ اگر تجھ کو خبر
ایسی ہشیاری سے کرتا نہ تو ایدھر کو نظر

اور مہ پارہ بھی اس شہر میں مشہور ہے اب | اُس کی محبوبی و خوبی ہی کا مذکور ہے اب
دیکھتا کچھ ہوں اسی کا مجھے منظور ہے اب | صرف اس پہ کروں گا اپنا جو مقصود ہے اب

اس کے منہ سے تری شام و سحر جاؤں گا

گھر سے جس دم اٹھوں گا اس کے ہی گھر جاؤں گا

میں بھی ناچار ہوں تا چند جفائیں سہوں   قصد رکھتا ہوں کہ اس شہر میں ہرگز نہ رہوں
یا اسی ماہ کنے جا رہوں گو ابھی ہوں   خوبیاں اور ترے حسن سلوک اس سے کہوں

کیں ترا مہر مری دونوں ہیں اس پر معلوم
اس کے معلوم ہوئے روئے دل اودھر معلوم

لگ چلوں اس سے صبا کی سی طرح شام و سحر   اس کے پانوں تلے کی خاک کروں کحل بصر
روئے گل رنگ سے اس کے نہ اٹھے میری نظر   چپکے اس کے لب شیریں سے رہیں دیدۂ تر

در ہی حال کی اس گیسوئے برہم سے رہے
جی کو بے طاقتی اس قد کے چم و خم سے رہے

فن معشوقی میں تیار کروں گا اس کو   شانۂ و آئینہ سے یار کروں گا اس کو
حسن سے اس کے خبردار کروں گا اس کو   ضد سے میں تیری بہت پیار کروں گا اس کو

فرش رہ دیدۂ نم ناک کروں گا واں کے
پلکوں سے خار و خسک پاک کروں گا واں کے

کس و ناکس اسی مہ پارے کا مفتوں ہوگا   ایسی سج سے تو اسے دیکھ کے محزوں ہوگا
رشک سے اس کے ترا حال دگرگوں ہوگا   دل نازک ترا دھڑکے گا جگر خوں ہوگا

شرم سے ہوگا نہ اک آنکھ اٹھانا مشکل
بلکہ ہو جاوے گا اس کوچے میں آنا مشکل

اب بھی گر سمجھے تو مجھ کو ہے وہی تجھ سے پیار   چھیڑ کا ننگ نہیں تیری نگاہی کا ہے عار
وہی مخلص ہوں قدیمی وہی ہوں تیرا ایلد   بندگی کیش و وفا شیوہ و اخلاص شعار

چوٹ مجھ کو بھی تو غیروں کی ملاقات کی ہے
چھوڑے یہ تو تو پھر آزردگی کِس بات کی ہے

مُسدّس دیگر

سچ کہو شہر میں یا صحرا میں کہاں رہتے ہو   یاں بہت رہتے ہو خوش باش کہ واں رہتے ہو
اِن دنوں یاروں کی آنکھوں سے نہاں رہتے ہو   خوش رہو میرؔ مری جان جہاں رہتے ہو
اِک طرف بیٹھے ہوئے ہم بھی لہو پیتے ہیں
عشق کی جان کو دیتے ہیں دعا جیتے ہیں

مدتیں گزریں کہ اے شوخ یہ خواری ہے مجھے   تجھ سے بے رحم ستم گار سے یاری ہے مجھے
روز و شب درد و غم و نالہ و زاری ہے مجھے   بلکہ ہر روز کی شب ہجر میں بھاری ہے مجھے
اہلِ دل جان سے رکھتا ہے مجھے عشق بہ تنگ
کاش کے دل کے عوض کوئی مِلا ہوتا سنگ

عاقبت کا نظر آیا نہ یک آثار ہمیں   دل کی بے تابی نے ہر چند رکھا خوار ہمیں
حیف صد حیف میسّر نہ ہوا بار ہمیں   تیرے کوچے میں کہیں سایۂ دیوار ہمیں
تاکہ واں نالہ و فریاد کیا کرتے ہم
اِک طرف بیٹھ تجھے یاد کیا کرتے ہم

مت برس خاک پہ عشّاق کی ہم کیا کم تھے   حیفِ دیروزہ ہی یہ دیدے ہمارے نم تھے

موجِ سیلاب پہ آنسو کے گہے عالم تھے   یعنی اے ابر کسی عہد میں ہم بھی نم تھے
عزم کر رونے کا آبادی سے گر اٹھتے تھے
بیٹھ کر دشت میں طوفان ہی کر اٹھتے تھے

کون تھا یاں کہ مجھے دیکھ ندامت رکھے   یا مرے سر پہ نصیحت سے قیامت رکھے
میرؔ صد سال خدا تجھ کو سلامت رکھے   تو نہ ہووے نہ مجھے کر کے ملامت رکھے
ورنہ اب تک تو مری خاک بھی ہو جاتی ہوا
لے گئی ہوتی تبرک کی طرح بادِ صبا

مسدس بہ طرزِ واسوخت

یاد ایام کہ خوبی سے خبر تجھ کو نہ تھی   سرمہ و آئینہ کی اور نظر تجھ کو نہ تھی
فکرِ آراستگیٔ شام و سحر تجھ کو نہ تھی   زلفِ آشفتہ کی سدھ دو دو پہر تجھکو نہ تھی
شانہ تھا نابلدِ کوچۂ گیسو تیرا
آئینہ کاہے کو تھا حیرتیٔ رو تیرا

آگہی حسن سے اپنے تجھے زنہار نہ تھی   اپنی مستی سے تری آنکھ خبردار نہ تھی
پاؤں بیڈول نہ پڑتا تھا یہ رفتار نہ تھی   ہر دم اِس طور کمر میں ترے تلوار نہ تھی
خون یوں کاہے کو کوچے میں ترے ہوتے تھے
دل زدے کب تری دیواروں تلے روتے تھے

شوق زینت سے نہ تھا ربط نہ رعنائی سے   دل نہ اتنا تھا لگا خوبیٔ مرزائی سے
اب تو سو بار کمر بندھتی ہے اکلائی سے   دیکھتے رہتے ہو ترکیب کو خود رائی سے

رؤسیہ آئینہ سے تم کو فراغت ہی نہیں
سُرمۂ تیرہ دروں سے کہیں فرصت ہی نہیں

پیش تر ہم سے کوئی تیرا طلب گار نہ تھا   ایک بھی نرگسِ بیمار کا بیمار نہ تھا
جنسِ اچھی تھی تری لیک خریدار نہ تھا   ہم سوا کوئی ترا رونقِ بازار نہ تھا

کتنے سودائی جو تھے دل نہ لگا سکتے تھے
آنکھیں یوں موند کے ٹُک جی نہ جلا سکتے تھے

یا تو ہم ہی تھے کہ اَب ہم سے نہیں کچھ یاری   مفت برباد گئی عزت و حرمت ساری
بارِ خاطر ہے اَب ہم کو بھی ہے بیزاری   یعنی اِس شہر سے اُٹھ جانے کی ہے تیاری

رُتبۂ غیر نہیں آنکھوں سے دیکھا جاتا
طاقت اب یہ دلِ بے تاب نہیں ٹک لاتا

کوئی نادیدہ محب سادہ لگالیں گے ہم   سادہ نامرتکب بادہ لگالیں گے ہم
بوس آغوش کا آمادہ لگالیں گے ہم   بند خود رائی سے آزادہ لگالیں گے ہم

اس کو آغوشِ تمنّا میں اَب اپنی لیں گے
اُس سے دادِ دلِ ناکام سب اپنی لیں گے

زندگانی ہو تجھے ہاتھ سے اُس کے دشوار   کوئی دن تو بھی پھرے جان سے اپنی بیزار
پہنچیں ہر آن میں اُن ہی تجھے سو سو آزار   طنز و تعریض کنائے کی رہی اِک بوچھار

جا کے ٹک سامنے اس کے تو بہت تر آوے
عرق شرم میں ڈوبا ہوا سب گھر آوے

دلِ واسوختہ کو اپنے لئے جاتے ہیں   غصّے سے خونِ جگر اپنا پئے جاتے ہیں

اپنی جا غیروں کو ناچار دئے جاتے ہیں　　اب کے یوں جاتے نہیں عہد کیے جاتے ہیں

آوے گا تو بھی منانے کو نہ تو آویں گے ہم
جان سے جاویں گے پیماں سے نہ جاویں گے ہم

بازگشت اب کی کسو طرح نہیں ہے منظور　　گو کہ درپیش ہمیں آوے رہِ دوراز دور
جانا ٹھانا تو پھر آنے کا یہاں کیا مذکور　　جی سے اپنے بھی گزر جائیے پر تا مقدور

مُنہ اِدھر کرئیے نہ جس جا سے پے اُٹھ جانا
قدر کھو دیوے ہے ہر بار کا آنا جانا

میر اعراض بھی لوگوں نے کیا ہے آگے　　دل کے واسوختے لوہو بھی پیا ہے آگے
خلق عالم سے کنارا بھی کیا ہے آگے　　عزت و وقر بھی برباد دیا ہے آگے

پر کنھوں نے نہیں اس ڈھب سے ان بازی کی
یہ بھی ظالم ہے کوئی طرزِ سخن سازی کی

ترکیب بند

میری تو بساط چشم تر ہے　　سو نذر ہے اس پہ گر نظر ہے
اس دشت میں زندہ ہوں پر جس میں　　ہر گام پہ جان کا خطَر ہے
کہہ تو ہی کہاں تلک کریں صبر　　ہم ہیں دَشنہ ہے اور جگر ہے
آنے سے ڈرو نہ دِل میں میرے　　خوباں یہ تو تمہارا گھر ہے
لبریز گلہ ہوں گرچہ لیکن　　ہونٹوں پہ نہ حرف کا اثر ہے
چُپ ہوں گویا ہوں بے زباں میں
رکھتا ہوں عجب لب و دہاں میں

تقصیر ہے بوالہوس کی او مفت　　مارا جاتا ہوں درمیاں میں
اُکسا بھی نہ تیغ کھا کے بارے　　فارغ ہوا دبے کے امتحاں میں
ہوں میں تو چراغ اخیر شب کا　　کوئی دم کا ہوں میہماں میں
دِل سوزی مری کرے صبا ٹک　　ہونے تئیں صبح کے کہاں میں
کوئی نہیں شہرِ غم میں میرا　　بے چارہ غریب ہوں گا یاں میں
غم کہہ کے رُلاتا ہوں میں سب کو　　تجھ غم میں ہوا ہوں نوحہ خواں میں
بارے میں یہ سب دیار دیکھا
ہر کوچہ کو بار بار دیکھا

شب ہی عالم میں ہو گئی تھی — اپنے دل کا غبار دیکھا
آنکھیں گئیں روتے روتے لیکن — تو نے نہ ادھر کو یار دیکھا
اب وعدہ نہ کر زیادہ بس ہم — جاناں ترا اعتبار دیکھا
کہتے تھے یہ ہم نہ کر تمنا — اے جانِ امیدوار دیکھا
مدت تئیں دید کر جہاں کا — طرز و وضع و شعار دیکھا

دیکھا تو ملا نہ کوئی ہم فن
دیکھے یہاں شیخ اور برہمن

عقل اول کو اک سنا تھا — نکلا سو معارضے میں کودن
آنکھوں میں ٹھہر رہے ہیں آنسو — ہونٹھوں پہ دھرا رہے ہے شیون
اے برق ادھر نہ آ ہمارے — ہر خوشے میں شعلوں کے ہیں خرمن
سختی ایام کی جو سہیے — ہو ویں ابھی موم سنگ و آہن
کیا تجھ سے سپہ گری جتاویں — گر خود و زرہ نہ ہو نہ جوشن

ایسے تو ہیں پہ وفا میں ویسے
خوباں تم ہو جفا میں جیسے

پھر جاتے ہیں غیر اس سے ملنے — آتے نہیں یاں نہ ایسے تیسے
سرکش نہ ہو زیر چرخ اُن نے — پامال کیے ہیں کیسے کیسے
ہاتھوں میں مرے ہیں داغ خوباں — کہتے ہیں کہ اس کنے ہیں پیسے
کیا تجھ سے کہوں معاش اپنی — بارے گزرے ہے جیسے تیسے

رہتا ہے غرض ہمیشہ سودا
کوچہ کوچہ ہوا ہوں رسوا

کہتے ہو جسے فلک ہوا ہے   میرے ہی غبار دل سے پیدا
ہو جس کی خراب عاقبت بھی   وہ میں ہوں کہ دین ہے نہ دنیا
میں ہوں کہ سرآمد جنوں ہوں   مجنوں کو خلیفہ میں کیا تھا
وہ خستہ ہوں میں ہی جس کو کہیے   رونق افزائے کوہ و صحرا
سودا نہیں کچھ وگرنہ مجھ کو   کرتا ہے کوئی زیان جی کا

گر اتنے پہ دل برا ہے میرا
موقوف کرو خدا ہے میرا

تھے جن و ملک جلو میں میری   اقبال مرا کوئی بلا تھا
تھا روئے زمیں پہ شاد و خرم   کیا جانوں فلک کے جی میں کیا تھا
ایسا ہی نہ تھا بتو میں آگے   آخر کوئی میرا بھی خدا تھا
ہوتے جو شہید یک تمنا   سو سو طرفوں سے خوں بہا تھا
ہوں اب جو بلا میں مبتلا میں   بیگانہ ہے جو کہ آشنا تھا

یہ رنج و بلائے درد و محنت
اے وائے حواس و صبر و طاقت

ادھر بھی کبھو ٹک ایک چشمک   ہم سے بھی ضرور ہے مروت
مت فرصت وقت سے ہو غافل   آخر کو نہ کھینچیے تا خجالت
ہر آن میں اپنی تربیت کر   دیتا ہے زمانہ کس کو فرصت

کیا تم سے کہیں سلوکِ ہجراں　　دل میں نہ رکھی ہمارے حسرت
قطرہ تو ہی پہ نہ ہاتھ اٹھاؤ　　دریا کو کرے ہے یہ کفایت
خالی دلِ پُر کو ہم بھی کرتے　　افسوس نہ دی اجل نے فُرصت
بس میرا ہو تو کروں منادی　　کوئی نہ کرے کہیں محبت
گردوں مارے شتابی اس کو
رکھے جو کسی سے تیرا الفت

ترکیب بند دیگر

عمر گزری ہو چکا آسودگی کا روزگار　　رنج و محنت کے تئیں آرام ہے ننگ و عار
معرکہ ہے یک طرف دونوں ہوئے ہیں سامنے　　زخمِ دل کی یہ ہنسی وہ گریۂ بے اختیار
عاشقی جب کی تھی میں نے تب نہ تھی تو خوار یار　　کیا کہوں کیا کچھ دکھاتا ہے مجھے اب ہجرِ یار
سینہ دیکھو چاک منہ ناخن سے سب نوچا ہوا　　آنکھیں دیکھو ڈوبی خوں میں جی کو دیکھو بے قرار
اے کہ گفتی عشق را درماں بہ ہجراں کردہ اند
کاشکی می گفتی کہ ہجراں را چہ درماں کردہ اند

اک نہ اے وے تو جو ہیں گے زمیں کے زیرِ پا　　خاک پر بسمل پڑے ہیں کیسے کیسے شیر ہاں
دو قدم پر ہے یہ ہنگامہ ترے کوچے کے بیچ　　آشتابی کچھ نہیں لگنے کی تجھ کو دیر ہاں
غم زدے بے خانماں بے وارث بیکس غریب　　زخموں کے دامن کے منہ پر ہو رہے ہیں ڈھیر ہاں
گر تو ہم آئی پے طوفِ شہیداں دُور نیست
گریہ می آید دریں جا راہ چنداں دُور نیست

ہیں خرابے آج جتنے کل یہ تھے لوگوں کے گھر　　مت بنائے خانہ میں منعم رہا کر اس قدر
طاقِ کسریٰ تو سُنا ہوگا کہ کیسا تھا محل　　اب کہیں اس طاق کا کسریٰ کے پیدا ہے اثر
خط باطل سے لکھا ہے صفحۂ سکون و مکاں　　کیوں دماغ اتنا جلاتا ہے بجے ہے تو کدھر
کیسے کیسے خانوادے خاک میں آہ مل گئے　　جائے عبرت ہے یہ معمورہ جہاں کا بے خبر

ہر کجا افتادہ بینی خشت در ویرانۂ
ہست فرد دفترِ احوال صاحب خانۂ

کم بہت سُننے میں آتا ہے کوئی رنجور ہے　　یا کسی مجروح کا زخم جگر ناسور ہے
روشنی آنکھوں کی ہے منظور ساری خلق کو　　قوتِ دل کا جدھر دیکھو تدھر مذکور ہے
ہم کنے بھی تھے یہ دو آتش کے پرکالے کبھو　　ان سے ہم ایذا جو کھینچی ہے کسے مقدور ہے
ایک نے مارا جھڑک کر جی سے ہمکو آہ داغ　　ایک نے جیسا جلایا اب تلک مشہور ہے
ہم کو حیرانی ہے اس میں جس کو سُنتے ہیں کہ ہے　　ان ہی دونوں آفتوں کی پرورش منظور ہے

ما سر شکِ گرم و آہِ آتشیں دیدیم و بس
بہرہ کز چشم و دل دیدیم و ایں دیدیم و بس.

دل نہیں مجھ کو ملا یہ کوئی جی کا ہے وبال　　گفتنی ہو تو کہوں اے میرؔ میں کچھ اس کا حال
خود بخود بجتا ہے کہتا آرزو کیا ہے اُسے　　چاہتا ہے سیم و زر یا کوئی دلبر خوش جمال
یاد میں میری ہوا ہو کچھ سبب تو ہے بجا　　عشق بازی مفلسی آزردگی رنج و ملال
نے کسو کے گیسو و کاکل کا وابستہ ہوں میں　　نے کسی کے چاند سے مکھڑے کا مجھکو ہے وبال
کیا کروں ایذائے بے موجب غرض تجھ سے بیاں　　نے غم دردِ جدائی ہے نہ اندوہِ وصال

نیستم عاشق بظاہر لیک میکاہد دلم
عمر بہ گزشت و نمی دانم چہ می خواہد دلم

رُباعیات

دامن عزلت کا اب لیا ہے میں نے
دِل مرگ سے آشنا کیا ہے مَیں نے
تھا چشمۂ آب زندگانی نزدیک
پر خاک سے اُس کو بھر دیا ہے مَیں نے

بُت خانے سے دِل اپنے اُٹھائے نہ گئے
کعبے کی طرف مزاج لائے نہ گئے
طور مسجد کو برہمن کیا جانے
یاں مدّتِ عُمر میں ہم آئے نہ گئے

دیار ستم گر نے لڑائی کی ہے
ایک ہی تلوار میں صفائی کی ہے
اِس کوچے کی راہ نقش پیری جاوے
واں میر بہت مَیں نے گدائی کی ہے

مِلنا دل خواہ اَب خیال اپنا ہے
جی تن میں رہا ہے سو وبال اپنا ہے
آزار بہت کھینچے ہیں اُس بِن دل نے
ہجران ہی شاید کہ وصال اپنا ہے

دل جان و جگر آہ جلائے کیا کیا
درد و غم و آزار کھنچائے کیا کیا

ان آنکھوں نے کی ہے ترک مردم داری
دیکھیں تو ہمیں عشق دکھائے کیا کیا

○

چپکا چپکا پھرا نہ کر تو غم سے
کیا حرف و سخن عیب ہے کچھ محرم سے
آخر کو رکے رہتے جنوں ہوتا ہے
اے میر کوئی بات کیا کر ہم سے

○

اب وقت عزیز کو تو یوں کھوؤگے
پر سوچ کے غفلت کے تئیں روؤگے
کیا خواب گراں پہ میل روز و شب ہے
جاگو ٹک میر پھر بہت سوؤگے

○

اے میر کہاں دل کو لگایا تو نے
شکل اپنی بگاڑ کر کڑھایا تو نے
جی میں نہ ترے حال نہ منہ پر کچھ رنگ
اپنا یہ حال کیا بنایا تو نے

○

دل جن کے بجا ہیں اُن کو آتی ہے خواب
آرام خوش آتا ہے سہاتی ہے خواب
میں غم زدہ کیا اپنے دنوں کو روؤں
میری تو جہاں شب ہی جاتی ہے خواب

○

دنیا میں بڑا روگ جو ہے اُلفت ہے
دق آ گئے ہیں جی سے بھی یہ زحمت ہے
کہتے تھے کہ میر بے وفا ہم کو نہ جان
کی خوب وفا تم نے تمہیں رحمت ہے

○

اندوہ کھپے عشق کے سارے دل میں
اب درد لگا رہنے ہمارے دل میں
کچھ حال نہیں رہا ہے دل میں اپنے
کیا جانیے وہ کیا ہے تمہارے دل میں

○

سُن سوزِ دروں کو اُس کے جلنے بجھنے ہر حرف پہ افسوس سے سر کو دُھنے
کیا کیا اب سانجھ سے کہے گا عالم آؤ ٹک میرؔ کی کہانی سُن نے

○

کیا کیا ہیں سلوک بہ فقط غم ہی نہیں پھر ہم سے جنوں میں ضعف سے دم ہی نہیں
اِک عمر چلی گئی جفائے شب و روز اب وہ تو نہیں شام سحر ہم ہی نہیں

○

کیا کہیے خراب ہوتے ہم کیسے پھرے دیکھا یہ بھی گو کہ سب کی نظروں سے گرے
چُپ ایسے ہیں گویا کہ نہیں منہ میں زباں جب نام ترا لیں تو زباں اپنی پھرے

○

شب ابر کو پیش رَو ہو دریا جس کا آیا دل داغ کر گیا جِس تِس کا
اِس سے ناگاہ ایک بجلی چمکی کیا جانیے اُس نے گھر جلایا کِس کا

○

ہم میرؔ سے کہتے ہیں نہ تو رویا کر ہنس کھیل کے ٹک چین سے بھی سویا کر
پایا نہیں جانے کا وہ دُرِ نایاب کڑھ کڑھ کے عبث جان کو مت کھویا کر

○

ابرو نے مہِ نو نے کہاں خم مارا ہونٹوں سے ترے لعل نے کب دم مارا
زلفوں کو تری ہم بھی پریشاں دیکھیں
اک جمع کو ان دونوں نے برہم مارا

جاں سے ہی بدن لطیف ور رُو ہی نازک
پاکیزہ ہے تیری طبع و خو ہی نازک
بُلبل نے سمجھ کے کیا تجھے نسبت دی
گل سے تو ہزار پردہ تو ہی نازک

پوچھو نہ اس بے سروپا کی خواہش
رکھتی نہیں حد اہلِ وفا کی خواہش
جاتے ہیں چلے جی ہی بتوں کی خاطر
معلوم نہیں کیا ہے خدا کی خواہش

آبِ حیواں نہیں گوارا ہم کو
کِس گھاٹ محبت نے اُتارا ہم کو
دریا دریا تھا شوق بوسہ لیکن
جاں بخش لبِ یار نے مارا ہم کو

کُچھ میر تکلف تو نہیں اپنے تئیں
اِن روزوں نہیں پاتے کہیں اپنے تئیں
اَب جی تو بہت ہی تنگ آیا اے کاش
جاویں ہم چھوڑ کر یہیں اپنے تئیں

راضی ٹک آپ کو رضا پر رکھیئے
مائل دِل کو تنک قضا پر رکھیئے
بندوں سے تو کچھ کام نہ نکلا اے میر
سب کچھ موقوف اب خُدا پر رکھیئے

حیرت ہے کہ ہو رقیب محرم تیرا
ہم رازو انیس وقت و ہم دم تیرا
یوں عکس ترے سامنے اکثر وہ ہو
جوں آئینہ مُنہ تکا کریں ہم تیرا

ہم سے تو بتوں کی وہ حیا کی باتیں — وہ طرہ نہ کلام اس ادا کی باتیں
دیکھیں قرآں میں فال غیروں کے لئے — کیا اُن سے کہیں یہ ہیں خدا کی باتیں

دل خوں ہے جگر داغ ہے رخسار ہے زرد — حسرت سے گلے لگنے کی چھاتی میں ہے درد
تنہائی و بے کسی و صحرا گردی — آنکھوں میں تمام آب منہ پر سب گرد

کچھ خواب سی ہے میرؔ یہ صحبت داری — اُٹھ جائیں گے یہ بیٹھے ہوئے یک باری
کیا آنکھوں کو کھولا ہے تنک گوش کو کھول — افسانہ ہے پل مارتے مجلس ساری

دل خوں ہوا ضبط ہی کرتے کرتے — ہم ہو ہی چکے دکھوں کے بھرتے بھرتے
اے مایۂ زندگی ستم ہے یہ اگر — بھر آنکھ تجھے دیکھیں نہ مرتے مرتے

کیا تم سے کہوں میرؔ کہاں تک روؤں — روؤں تو زمیں سے آسماں تک روؤں
جوں ابر جہاں جہاں بھرا ہوں غم سے — شایستہ ہوں رونے کا جہاں تک روؤں

میرؔ اس سے ملے کہ جو ملا بھی نہ کبھو — جی یوں ہی گیا وہ آ پھرا بھی نہ کبھو
چپ جس کے لئے لگ گئی ایسی ان کو
اُن نے کچھ زیرِ لب کہا بھی نہ کبھو

کیا کیا اے عاشقی ستایا تو نے — کیسا کیسا ہمیں کھپایا تو نے
اول کے سلوک میں کہیں کا نہ رکھا — آخر کو ٹھکانے ہی لگایا تو نے

کیا میرؔ کا مذکور کریں سب ہے جہل — پایا ہم نے اُسے نہایت ہی سہل
ایسوں سے نہیں مزاج اپنا مانوس — وحشی بے طور بد زبان و نا اہل

حیرت کی یہ معرکے کی جا ہے یارے — کیا پوچھتے ہو مرتے ہیں عاشق سارے
مشہور ہے عشق نے لڑائی ماری — اس پر کہے گئے لوگ سب اس کے مارے

ملیے اُس شخص سے جو آدم ہووے — ناز اس کو کمال پر بہت کم ہووے
ہو گرم سخن تو گرد آوے یک خلق — خاموش رہے تو ایک عالم ہووے

ہر صُبح غموں میں شام کی ہے ہم نے — خوں نابہ کشی مدام کی ہے ہم نے
یہ مہلت کم کہ جس کو کہتے ہیں عُمر — مَر مَر کے غرض تمام کی ہے ہم نے

مدت کے جو بعد جی بحال آتا ہے — خاطر پہ جہاں جہاں ملال آتا ہے
وے دِن گئے جان یوں چلی جاتی ہے آہ
رہ رہ کے ہمیں یہی خیال آتا ہے

ہیں گو کہ سبھی تمہاری پیاری باتیں
پر جی سے نہ جائیں گی تمہاری باتیں
آنکھیں ہیں ادھر روئے سخن اور طرف
یاروں کی نظر میں ہیں یہ ساری باتیں

ایسا نہ ہوا کہ ہم نے شادی کی ہو
یا سیرِ بہار و باغ و وادی کی ہو
پژمردہ کلی کے رنگ اس گلشن میں
غالب ہے یہی کہ نامرادی کی ہو

اتنے بھی نہ ہم خراب ہوتے رہتے
کاہے کو غم و الم سے روتے رہتے
سب خوابِ عدم سے چونکنے کے ہیں وبال
بہتر تھا یہی کہ وہیں سوتے رہتے

ہر صبح مرے سر پہ قیامت گزری
ہر شام نئی ایک مصیبت گزری
پامال کدورت ہی رہا یاں دن رات
یوں خاک میں ملتے ہم کو مدت گزری